جلد 7 شمارہ 1

چیلنج

جنوری تا اپریل 2014

ایڈیٹرز: عذرا طلعت سعید رصبیحہ حسن

وہ نہر خوں جو میری صدا ہے۔

عوام کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں استحصال اور استعماری طاقتیں عروج پر ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے ظلم کی وجہ دراصل وہ زوال ہے جس کے ہاتھوں سرمایہ دارانہ نظام ڈگمگا رہا ہے۔ ایک طرف رکازی ایندھن یعنی کوئلہ، قدرتی گیس اور تیل کے کم ہوتے ہوئے ذخائر ہیں، جو اس کے منافع کمانے کی صلاحیت پر کاری ضرب کا کام کررہے ہیں اور دوسری طرف باشعور عوام ہیں جو اب اس نظام کی سفاکی اور تباہ کاریاں جن میں عدم مساوات، عدم انصاف اور موسمی تبدیلی ہیں کا مکمل خاتمہ چاہتے ہیں۔

رکازی ایندھن کی بدولت صنعتی پیداوار نے پچھلے پانچ سو سال کے عرصے میں کئی طرح سے مزدور کسان کا استحصال کرتے ہوئے اسے برباد کیا۔ مشین نے اس کی روزی کم سے کم کردی۔ عجب ہے کہ یہی مزدور کسان جو سرمایہ دار و جاگیردار کو تمام دولت کما کر دیتا ہے، کبھی شہر میں ٹھوکریں کھا کر بمشکل جی پاتا ہے تو کبھی پردیس جاکر ذلتوں کے ڈھیر میں مٹھی بھر پونجی جمع کرپاتا ہے۔ منافع کی ہوس نے قدرتی وسائل کا اس قدر استحصال کیا کہ لاکھوں سال کے بیش بہا ذخائر کچھ ہی سالوں میں نچوڑ کر ختم کردیے گئے۔ کہیں بڑے بڑے جنگلات کو کاٹ کر شہر بسا دیے گئے، کہیں پہاڑ تراش کر اور کہیں زمین کھود کر قدرتی نظام کو بے دردی سے کچل دیا گیا ہے۔ صدیوں پر محیط آبادیاں اجاڑ دی گئیں۔ گاؤں کے گاؤں برباد ہوکر وحشت کا نمونہ بن گئے ہیں۔

ترقی کو بڑے بڑے شہروں اور ان سے جڑی سہولیات سے ناپا جاتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے کارخانے لگا دیے جاتے ہیں جو فضاء میں کیمیائی زہر گھول رہے ہیں۔ اس زہریلے مواد نے کہیں زمین اناج اگانے کے قابل نہیں چھوڑی اور کہیں فضاء زہر آلود ہوکر تیزابی بارش کا باعث بن گئی ہے۔ آبی حیات اس زہر کو اپنے اندر جمع کرکے خود بھی متاثر ہوتے ہوئے باقی حیاتیات کے لیے بھی شدید نقصاندہ ثابت ہورہی ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کیمیائی اجزاء کی بدولت ماؤں کے پیٹ میں بھی بچے محفوظ نہیں۔

عالمی ادارہ برائے صحت کے مطابق صنعتی آلودگی کی وجہ سے صرف 2012 میں 40 لاکھ انسان ہلاک ہوئے۔ ان اموات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا وہ سرمایہ دار قابل سزا نہیں جو صرف منافع کی خاطر ماحولیاتی آلودگی پھیلاتا ہے؟

ان حالات میں بپھرے ہوئے عوام کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے آج پھر دنیا بھر کی سرکار اکھٹی ہوئی ہیں کہ عدل و انصاف کو بنیاد بنا کر پائیدار ترقی کے حصول کے لیے بھوک و غربت کو پیچھے دھکیلیں اور قدرت کو سنبھالیں۔ منافع کے حصول کو مقدم جانتے ہوئے سرمایہ داری کے لڑکھڑاتے نظام کو سہارا دینے کے لیے بین الاقوامی کمپنیاں اس کمزور اصلاح پسند عمل کو بھی متزلزل کرنے کی کوششوں میں ملوث ہیں۔ سامراج اور اس کے کارپوریٹ شعبے کے لیے عدم مساوات کا حل صرف ''چمکتی دمکتی'' منڈی ہے۔ اپنی تحقیق کو اعلیٰ درجہ دے کر نت نئی، عوام دشمن، ماحول دشمن ٹیکنالوجی کا پرچار کرکے کسان کو کبھی سبز معیشت تو کبھی نیلی معیشت کے نام پر نئے جال میں پھنسایا جارہا ہے۔ دولت کے بھوکے ایک دفعہ پھر مزدور و کسان کے خلاف صف آرا ہیں۔ ان کے مسکراتے چہروں، عالی شان محلات اور چمکتی گاڑیوں سے قانون، سرکار، وکلاء، ماہرین طب اور دانشور سبھی مرعوب و مسحور ہیں، مگر مزدور و کسان نہیں! کیونکہ ان کو سمجھ ہے کہ یہ نہ ہو تو کون اناج اگائے گا؟ کون پتھر توڑے گا؟ کون مشین کے پرزے جوڑے گا؟ کون کوئلہ کانوں سے نکالے گا؟ مزدور و کسان کی محنت کے پھل پر جاگیردار و سرمایہ دار قابض ہے لیکن اب یہی زور بازو کرے گا مسمار ظلم کے ہر ہتھیار کو، استحصال کی ہر چال کو!

فہرست مضامین

سرمایہ کاری: مزدور بستیوں اور ماحول پر اثرات .. 2
پائیدار ترقی نجکاری کے شکنجے میں! 9
زراعت میں ایف اے او کا کردار 18
پدرشاہی نظام: ماضی کی ایک جھلک 23
پاکستانی نوجوان اور تعلیم 29
بات تو سچ ہے مگر 37

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

سرمایہ کاری: مزدور بستیوں اور ماحول پر اثرات

تحریر: آصف خان

بیسٹ وے گروپ

چیلنج کے پچھلے شمارے (جلد6، شمارہ 2، 2013) میں حطار، ہری پور میں واقع مستحکم سیمنٹ کے کارخانے کو نجکاری پالیسی کے تحت بیسٹ وے گروپ کو فروخت کرنے سے عام لوگوں، آبادیوں اور مزدوروں پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ زیر نظر مضمون میں بیسٹ وے گروپ جو ایک بین الاقوامی کمپنی ہے، کے بارے میں تفصیلات پیش کی جارہی ہیں، جو کہ زیادہ تر اس ادارے کی ویب سائٹس سے حاصل کردہ ہیں۔ بیسٹ وے سیمنٹ کی طرف سے اپنے کاروبار کے متعلق دیے گئے بیانات کا موازنہ کمپنی کے حطار میں قائم کارخانوں کے آس پاس کی آبادیوں پر پڑنے والے ماحولیاتی اثرات سے کیا جائے گا۔

آج سے تیس سال قبل ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری انور پرویز نے یہ گروپ قائم کیا۔ یہ ادارہ برطانیہ میں خوراک کی خرید و فروخت کا کاروبار کرنے والا سب سے بڑا گروپ ہے اور برطانیہ کے ہول سیل کے کاروبار میں دوسرا درجہ رکھتا ہے۔ بیسٹ وے گروپ برطانیہ کی اٹھارویں سب سے بڑی نجی کمپنی ہے جو خاندانی ملکیت پر مبنی کاروبار میں ساتویں درجے پر آتی ہے۔ اس کمپنی کا سالانہ ٹرن اوور (turn over) چھ بلین امریکی ڈالر ہے۔[1] 1999 میں برطانوی بادشاہت اور برطانیہ کے لیے خدمات کو سراہتے ہوئے ملکہ برطانیہ نے انور پرویز کو سر کے خطاب سے نوازا۔ سر انور پرویز اور بیسٹ وے گروپ کے برطانوی سیاسی پارٹی جو کہ کنزرویٹیو پارٹی (Conservative Party) کہلاتی ہے سے گہرے مراسم ہیں۔ سر پرویز اپنے آپ کو تھیچرائیٹ (Thatcherite) یعنی برطانیہ کی سابق وزیر اعظم میڈم تھیچر کے فلسفہ پر چلنے والا مانتے ہیں۔[2]

پاکستان میں بیسٹ وے گروپ بیسٹ وے سیمنٹ کا مالک ہے جو کہ ملک میں سیمنٹ بنانے والا دوسرا بڑا کارخانہ ہے۔ اس کے علاوہ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ جو کہ ملک کا دوسرا بڑا نجی بینک ہے، بیسٹ وے گروپ کی ملکیت ہے۔[3]

بیسٹ وے سیمنٹ: پاکستان میں کارکردگی[4]

پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہری پور کے علاقے حطار میں 1994 میں بیسٹ وے گروپ نے سیمنٹ کی پیداوار شروع کی۔ بیسٹ وے سیمنٹ کے کارخانے پر 120 ملین ڈالر کی لاگت آئی۔ کارخانے کو پاکستان پہنچانے کا ٹھیکہ جاپان کی کمپنی مٹسوبیشی (Mitsubishi) کو 1995 میں دیا گیا اور دیگر سامان جرمنی، امریکہ اور سوئٹزرلینڈ سے منگوایا گیا۔ 2001 تک یہ سیمنٹ پلانٹ فرنس آئل پر چل رہا تھا جو کہ کمپنی کو مہنگا پڑ رہا تھا۔ اس لیے اس کو قدرتی گیس پر منتقل کر دیا گیا۔ بیسٹ وے گروپ کے مطابق یہ پیداواری لاگت کم کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ پیداواری لاگت کو مزید کم کرنے کے لیے کارخانے کو کوئلے پر منتقل کر دیا گیا۔ جس سے پیداواری لاگت میں 65 فیصد کمی واقع ہوئی۔ کمپنی کے مطابق بیسٹ وے سیمنٹ کے پاس کوئلہ کی کوالٹی کو چیک کرنے کے لیے انتہائی جدید لیبارٹری ہے، جس کی مدد سے اعلیٰ معیار کا کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں کارخانے کی پیداواری صلاحیت ایک ملین ٹن سالانہ تھی۔ 2002 اور 2004 میں سیمنٹ کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوا۔ اب اس کارخانے کی کل پیداوار 1.25 ملین ٹن سالانہ ہے۔[5] مارکیٹ میں سیمنٹ کی طلب کو مد نظر رکھتے ہوئے، بیسٹ وے گروپ نے 2004 میں صوبہ پنجاب کے ضلع چکوال میں دو سیمنٹ کے کارخانے لگائے۔ دونوں کی پیداواری صلاحیت الگ الگ 1.8 ملین ٹن سالانہ ہے۔

مستحکم سیمنٹ

2005 میں بیسٹ وے گروپ نے 0.6 ملین ٹن پیداواری صلاحیت کا کارخانہ مستحکم سیمنٹ، پاکستان نجکاری کمیشن سے سب سے زیادہ بولی، 3.2 بلین روپے میں خرید لیا۔[6] مستحکم سیمنٹ بھی صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہری پور کے علاقہ حطار میں واقع ہے۔ پچھلے سال 2013 میں مستحکم سیمنٹ کو بیسٹ وے سیمنٹ میں زم کر دیا گیا تا کہ پیداواری عمل میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاسکے۔

2008 تک بیسٹ وے گروپ نے سیمنٹ کی صنعت میں جتنی سرمایہ کاری کی اس سے بیسٹ وے سیمنٹ کی کل پیداوار چھ ملین ٹن سالانہ ہوگئی ہے۔ اس طرح یہ گروپ اب پاکستان میں دوسرا بڑا سیمنٹ پیدا کرنے والا ادارہ ہے۔ بیسٹ وے گروپ کے مطابق فروری 2001 میں اسٹاک ایکسچینج میں 850 فیصد پوائنٹس کے ساتھ بیسٹ وے سیمنٹ بڑی کاروباری کمپنیوں کی فہرست میں شامل ہوگئی۔

بیسٹ وے سیمنٹ: معاشی اثرات

بیسٹ وے گروپ کے مطابق ان کا فلسفہ ہے کہ ''ان کی مدد کی جائے جو دوسروں سے کم خوش قسمت ہیں۔''[7] اس فلسفے کا غیر جانب دار موازنہ کریں تو یہ ماننا مشکل دیکھائی دیتا ہے۔

جس شعبہ میں اس گروپ نے سرمایہ کاری کی ہے وہ نہایت منافع بخش ہے کیونکہ سیمنٹ بنانے کے لیے درکار خام مال یعنی جپسم (gypsum)، چونا (لائم اسٹون) اور چکنی مٹی (clay) وغیرہ پاکستان میں وافر مقدار میں سستے داموں دستیاب ہیں۔[8] ایک سال میں بیسٹ وے سیمنٹ لمیٹڈ کے منافع میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ مثلاً 2011 میں کمپنی کا بعد از ٹیکس 0.2 بلین روپے منافع بتایا گیا اور 2012 میں 3.1 بلین روپے۔ یعنی ایک سال کے عرصے میں منافع کی شرح 1500 فیصد بڑھ گئی۔ بیسٹ وے کے مطابق منافع بڑھنے کی وجہ قومی سطح پر سیمنٹ کی مانگ میں اضافے کے علاوہ کوئلے کی قیمت میں کمی اور بہتر طریقہ پیداوار ہے۔[9] 2013 میں منافع 6.3 بلین روپے بتایا گیا جو پچھلے سال سے تقریباً 75 فیصد اضافہ ہے۔[10]

بیسٹ وے گروپ کا یہ بھی کہنا ہے کہ انہوں نے سیمنٹ کی صنعت لگا کر 3000 سے زائد لوگوں کو روزگار فراہم کیا ہے، مگر حقائق اس کے برعکس ہیں۔

جیسا کہ پچھلے مضمون میں لکھا گیا تھا کہ نجکاری سے پہلے مستحکم سیمنٹ میں 2500 مزدور کام کرتے تھے۔ تمام مزدور سرکاری ملازم تھے اور ایک بہتر روزگار پر فائض تھے۔ اب خود بیسٹ وے تسلیم کرتا ہے کہ مستحکم سیمنٹ میں صرف 600 مزدور کام کررہے ہیں۔[11] پاکستان میں مزدوروں کی اجرت بہت کم ہے، چاہے وہ دھاڑی پر کام کررہے ہوں یا پھر ماہانہ اجرت پر ہوں۔ مزدوروں کو حقوق نہیں دیے جاتے اور نہ ہی مراعات دی جاتی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان میں صنعت لگانا سرمایہ دار کے لیے نہایت منافع بخش ہے۔

بیسٹ وے سیمنٹ کا کارخانہ حطار میں بہت زرخیز زمین پر قائم کیا گیا، جس پر 350 سے زائد خاندان آباد تھے، جو اس زمین سے خود بھی کھاتے تھے اور باقی پاکستان کے لوگوں کو بھی کھلا رہے تھے۔ کارخانے کی قیام سے ان لوگوں کا روزگار ختم ہوگیا۔ زیادہ تر زمین رانی واہ، شادی گاؤں سے اور کچھ کامل پور گاؤں سے حاصل کی گئی۔ 1994 میں بیسٹ وے گروپ نے زمین کسانوں سے اس کی اصل قیمت سے کم پر زبردستی حاصل کی۔ کسانوں نے زمین بچانے کے لیے کافی جدوجہد کی، لوگ گرفتار بھی ہوئے اور مختلف جیلوں جن میں ہری پور اور ڈیرہ اسماعیل خان جیل شامل ہیں، میں قید بھی کیے گئے۔ مقامی سیاسی رہنماؤں نے کسانوں کی زمین بچانے میں ان کی خاطر خواہ مدد نہیں کی بلکہ زیادہ تر حکومتی نمائندوں نے بیسٹ وے گروپ کا ساتھ دیا۔ جس کے نتیجے میں بیسٹ وے سیمنٹ نے حطار کے کارخانے کے لیے 2,200 کنال زرخیز اراضی حاصل کرلی اور کارخانہ لگانے کا کام شروع کردیا۔ اب کارخانہ بھرپور پیداوار دے رہا ہے، اس کارخانے میں جن لوگوں کی زمین گئی ان میں سے چند کو ہی روزگار دیا گیا۔ بیسٹ وے سیمنٹ حطار میں کام کرنے والے زیادہ تر مزدوروں کا تعلق دوسرے اضلاع اور صوبہ سے ہے۔[12]

بیسٹ وے سیمنٹ: ایک گھرانے پر اثرات

محمد مسکین گاؤں رانی پور کے باسی ہیں۔ بیسٹ وے سیمنٹ کا کارخانہ ان کے گھر کے قریب ہی ہے۔ محمد مسکین کسان ہیں، وہ اپنی 30-20 کنال زمین پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ سیمنٹ فیکٹری لگنے سے دس سال پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے پاس پہلے تقریباً 90 کنال زمین تھی جو بیسٹ وے فیکٹری لگانے کے لیے چھین لی گئی اور اب صرف 30 کنال رہ گئی ہے۔ ان کے دو بھائی زمین کم ہونے کی وجہ سے علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔

محمد مسکین کا کہنا ہے کہ بیسٹ وے فیکٹری میں جلنے والے کوئلے نے ان کی جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ گھر کی ہر چیز کالی پڑ گئی ہے۔ پورا گھر بند کرنے کے باوجود کوئلہ جلنے سے راکھ اور گردوغبار اندر آتا ہے۔ محمد مسکین نہایت رنجیدگی سے بتاتے ہیں کہ ''اس قدر گرد وغبار سے ہماری ٹانگیں کالی ہوگئی ہیں۔ دھونے پر بھی صاف نہیں ہوتیں۔ ہماری حالت اتنی خراب ہے کہ شادی یا کسی کے غم میں شرکت نہیں کرتے، ہمیں شرم آتی ہے۔ اس کے علاوہ پورا خاندان کئی بیماریوں کا شکار ہے۔ چکر آنا، خارش اور دیگر الرجیاں ہوگئی ہیں۔ ہر وقت الٹی آتی رہتی ہے۔''

محمد مسکین نے مزید بتایا کہ کوئلے کی راکھ اور دوسری آلودگیوں سے اب ہمارے مویشی بھی بیمار پڑنے لگے ہیں۔ ان کا دودھ کم ہوگیا ہے اور اس میں سے اب بدبو بھی آتی ہے۔ ہمارے کھیت بھی بنجر ہوتے جارہے، پہلے کھیت سے فی ایکڑ 90 من گندم ہوتی تھی اب کم ہوکر 40 من فی ایکڑ رہ گئی ہے۔ جو فصل ملتی ہے وہ بھی کالی ہوتی ہے۔ اوپر کی فصل پر فضلہ جمع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے صحیح کاٹ بھی نہیں سکتے۔ یہ اتنی خراب ہوتی ہے کہ اس کو جانور بھی نہیں کھاتے۔ ان کے خیال سے اب اس فیکٹری والوں نے ایندھن کے طور پر ربڑ اور پلاسٹک کا استعمال شروع کر دیا ہے جو زیادہ نقصان دہ ہے اور اس کی وجہ سے گاؤں والے پہلے سے زیادہ متاثر ہورہے ہیں۔

سیمنٹ فیکٹری سے آلودگی کے خلاف محمد مسکین کہتے ہیں ''میں نے مزاحمت کرتے ہوئے کئی دفعہ فیکٹری کے باہر احتجاج کیا، پتھر مارے، ان کے ایک گاڑی کے شیشے بھی توڑ دیے، یہاں تک کہ میں نے اپنے آپ کو جلانے کی بھی دھمکی دی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔''

محمد مسکین کے مطابق اب سننے میں آرہا ہے کہ بیسٹ وے توانائی حاصل کرنے کے لیے کوئلہ سے چلنے والا پلانٹ لگارہی ہے جس سے علاقہ یقیناً مزید خراب اور آلودہ ہوگا۔ جب سے بیسٹ وے نے نئے پاور پلانٹ پر کام شروع کیا، بڑے بڑے لوگوں کو رشوت دی گئی ہے تاکہ وہ خاموش رہیں اور پلانٹ لگنے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ عام لوگوں کو راشن، چاول، گھی اور آٹا تقسیم کرنے لگے ہیں تاکہ وہ بھی ان کے خلاف آواز نہ اٹھائیں۔

بیسٹ وے گروپ کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی سیمنٹ کی صنعت کو تیل سے گیس اور پھر گیس سے کوئلہ پر منتقل کردیا ہے۔ جس سے توانائی کی بچت ہوگی۔ ہاں بچت تو ہوگی لیکن عوام کو نہیں۔ حطار یونین کونسل کے آٹھ گاؤں میں سے صرف دو گاؤں میں قدرتی گیس دستیاب ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں لکڑی استعمال کرتے ہیں جو بہت مہنگی پڑتی ہے لیکن بیسٹ وے سیمنٹ حطار کے لیے بجلی، گیس اور کوئلہ کسی شئے کی کمی نہیں۔

بیسٹ وے کے کارخانے کو حکومت جو سہولتیں فراہم کررہی ہے وہ کوئی عام روش سے ہٹ کر بھی نہیں ہے۔ دنیا بھر میں یہ دیکھا جارہا ہے کہ حکومتیں اپنی بنیادی ذمہ داری جو کہ عوام کی فلاح ہے، سے ہٹ چکی ہیں۔ حکومت نے نجی شعبہ کو ان داتا مانتے ہوئے اس شعبہ کے لیے بڑھ چڑھ کر سہولیات فراہم کرنے کا عزم کیا ہوا ہے۔ شاید نجی شعبہ اسی طرز حکمرانی کو کارپوریٹ گورننس کہتا ہے۔

بیسٹ وے گروپ فخر سے کہتا ہے کہ بیسٹ وے سیمنٹ نے اپنے تمام کارخانوں کی پیداوار کو دگنا کر دیا ہے۔ اگر حقیقی تجزیہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ عوام اور خاص کر مزدوروں کو اس بڑھتی ہوئی پیداوار سے شدید نقصان پہنچا ہے۔ مزدور طبقے پر ہونے والا استحصال پچھلے شمارے میں تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے۔ سرمایہ درانہ پیداواری نظام میں مزدور کے استحصال کی بنیاد پر ہی دولت اکھٹی اور منافع کمایا جانا ممکن ہے۔ بیسٹ وے گروپ برطانیہ کی کنزرویٹیو پارٹی کی سیاست کو اپناتا ہے۔ جو تاریخی طور پر آزاد تجارت کی حامی ہے۔ کنزرویٹیو پارٹی کی سابق وزیر اعظم میڈم تھیچر جو کہ 1979-1990 تک پارٹی کی صدر بھی رہی ہیں، ان کی رہنمائی میں عالمی سطح پر گلوبلائزیشن کو بہت فروغ ملا۔ گلوبلائزیشن یا نیولبرل ازم کی بنیاد مزدور دشمن پالیسیوں مثلاً نجکاری، آزاد تجارت اور ڈی ریگولیشن پر مبنی ہے۔

یہ عام خیال ہے کہ نیو لبرل ازم جسے واشنگٹن کنسینسس (Washington Consensus) بھی کہا جاتا ہے، بنیادی طور پر امریکی صدر رانلڈ ریگن اور برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کی تخلیق تھی اور خاص کر نجکاری پالیسی کو میڈم تھیچر کی حمایت حاصل تھی۔[13] ان پالیسیوں کو بہت بڑے پیمانے پر تیسری دنیا کے کئی ممالک پر زبردستی لاگو کیا گیا۔ آج کی بڑھتی ہوئی مہنگائی بھوک اور بے روزگاری ان ہی پالیسیوں کا نتیجہ ہیں۔

بیسٹ وے سیمنٹ: ماحول پر اثرات

سیمنٹ کی پیداوار بڑھنے سے عوام کو جو دوسرا بڑا نقصان ہوا وہ یقیناً قدرتی وسائل کا بڑے پیمانے پر استحصال ہے۔ جیسے کہ پہلے بتایا گیا لائم سٹون، چکنی مٹی اور جپسم کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان قدرتی وسائل کو حاصل کرنے کے عمل میں بڑی بڑی کھائیاں (quarries) بن جاتی ہیں جس سے اردگرد ساری ہریالی ختم کردی جاتی ہے۔

بیسٹ وے سیمنٹ، آس پاس کی آبادیوں سے مٹی حاصل کررہا ہے۔ کبھی کمپنی خود زمین خرید لیتی ہے اور کبھی کسانوں سے لیز پر لے کر وہاں سے مٹی حاصل کی جاتی ہے۔ جس سے آبادیوں کے قریب زمین میں سیکڑوں فٹ گہری کھائیاں بن گئی ہیں۔ جس سے علاقے میں رہنے والے انسانوں اور حیوانات کی زندگیوں کو شدید خطرہ لاحق ہے۔

تیسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ جب پیداوار کو بڑھایا جاتا ہے تو اس کے لیے توانائی جو کہ رکازی ایندھن (یعنی کوئلہ، قدرتی گیس اور تیل) کا استعمال بہت بڑھ جاتا ہے۔ رکازی ایندھن کے علاوہ اب سیمنٹ کی پیداوار میں ایندھن کے طور پر پرانے ٹائروں کا استعمال بھی کیا جارہا ہے۔ جن سے ماحول کو ہونے والے نقصان کا پوری طرح سے اندازہ لگانا اور اس کا ازالہ ناممکن ہے۔

بقول بیسٹ وے ''ماحول ہماری ترجیح ہے'' جبکہ سیمنٹ کی صنعت ماحول کے لیے نقصاندہ ترین صنعتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ سیمنٹ کی صنعت موسمی بحران پیدا کرنے والی صنعتوں میں پاور پلانٹس اور آئل ریفائنریز کے بعد تیسرے درجے پر ہے۔[14] اگر واقعی بیسٹ وے کی ترجیح ماحول ہے تو وہ اس ماحول دشمن کاروبار میں حصہ کیوں لے رہے ہیں؟

سیمنٹ کے پیداواری مراحل میں ایسا مواد خارج ہوتا ہے جو ماحول کو بے تحاشہ آلودہ کرتا ہے۔ جس میں نہایت باریک گرد، کئی طرح کی گیسیز، شور اور تھرتھراہٹ شامل ہیں۔ یہ گرد کئی طرح کے کیمیائی اجزاء پر مبنی ہوتی ہے جو مختلف امراض کا باعث بنتی ہے۔ مثلاً پھیپھڑوں کی کارکردگی میں کمی، دمہ، کھانسی سانس لینے میں مشکلات اور ناک اور گلے میں مستقل تکلیف رہتی ہے۔[15]

سیمنٹ کی پیداوار سے ہونے والی آلودگی میں چار کلیدی اجزاء (i) سلفر ڈائی آکسائیڈ (ii) نائٹروجن آکسائیڈ (iii) پارہ (مرکری) اور (iv) باریک گرد جسے پارٹیکیولیٹ میٹر (Particulate Matter/PM) کہا جاتا ہے شامل ہیں۔[16]

سلفر ڈائی آکسائیڈ پانی میں آسانی سے حل ہو جاتی ہے جو کہ تیزابی بارش (acid rain) کا ایک بڑا حصہ ہے۔ جو جنگلات اور فصلوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس سے زمین کی تیزابیت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تالابوں اور نہروں کے پانی میں بھی تیزابیت پیدا ہو جاتی ہے جو مچھلیوں کے لیے نہایت مضر ہے۔[17] اس کے علاوہ سلفر ڈائی آکسائیڈ سانس اور دل کے امراض میں شدت پیدا کرتی ہے اور خاص کر کے دمہ اور برانکائیٹس کے مریضوں، بچوں اور بوڑھوں کے لیے نہایت نقصاندہ سمجھتی جاتی ہے۔[18]

کاربن مونو آکسائیڈ بھی سیمنٹ کی پیداوار سے خارج ہوتی ہے جو کہ انسانی جسم میں آکسیجن کی کمی کرتی ہے اس کے علاوہ دل اور مرکزی اعصابی نظام

پر منفی اثرات ڈالتی ہے۔[19]

نائٹروجن آکسائیڈ میں دو گیسیز شامل ہیں نائٹروجن آکسائیڈ (NO) اور نائٹروجن ڈائی آکسائیڈز (NO2)۔ دونوں تیزابی بارش بننے کے عمل میں شامل ہیں جس کے اثرات پہلے بتا دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ زمین کی درجہ حرارت بڑھنے کی ایک وجہ بھی ہے۔ یہ گیس بینائی پر بھی منفی اثر ڈالتی ہے اور پھیپھڑوں کے ٹشو کو نقصان پہنچاتی ہے۔[20]

سیمنٹ کے کارخانے سے پارہ (Mercury) ہوا میں خارج ہو کر بخارات کی شکل میں فضاء میں پھیل کر قریبی ندیوں، نہروں اور دیگر پانی کے ذخائر میں جمع ہو جاتا ہے۔[21] وہاں جراثیمی حرکت سے پارہ ایک اور کیمیائی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کو میتھائل مرکری کہا جاتا ہے۔ یہ کیمیائی اجزاء مچھلی اور دیگر آبی جانداروں میں جمع ہو کر نا صرف ان کے لیے نقصاندہ ہے بلکہ ان انسانوں اور جانوروں کے لیے بھی زہر آلود ہے جو آبی حیات کو خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پارہ نیوروٹوکسن (neurotoxin) ہوتا ہے یعنی اعصاب (nerves) کے لیے نقصاندہ ہے۔ یہ دماغ اور اعصابی نظام میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے بچوں میں پیدائشی نقص، آئی کیو (IQ) میں کمی اور نشو ونما میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پارہ خاص کر چھوٹے بچوں اور ماں کے پیٹ میں بچے (fetus) کے لیے نہایت مضر ہے۔[22] یہاں بتانا یہ لازم ہے کہ حکومت پاکستان نے پارے کے اخراج کے لیے جو حد متعین کی ہے وہ باقی کئی ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً مصر، نائیجریا اور برازیل میں پارے کی حد 0.05-0.10mg/Nm3 ہیں۔ جبکہ پاکستان میں یہ حد 10mg/Nm3 ہے۔[23]

خیال رہے کہ خان پور ڈیم حطار سے بمشکل پانچ سے آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اگر پارے کے بخارات خان پور ڈیم میں گر رہے ہیں تو جو لوگ یہاں مچھلی کا شکار کرتے ہیں یا پھر خان پور روڈ کے مچھلی بازار سے خریدتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ وہ صحت کے حوالے سے کئی طرح کے خطرات کا سامنا کر رہے ہوں۔

اس کے علاوہ دیگر دھات بھی بہت کم مقدار میں (trace elements) سیمنٹ کی پیداوار کے نتیجے میں ماحول میں پائی جاتی ہیں۔ بیسٹ وے سیمنٹ سمیت پاکستان میں کئی فیکٹریاں ہیں جن کے پیداواری عمل میں یہ ٹریس ایلیمنٹس پائے گئے ہیں۔ بیسٹ وے سیمنٹ کی پیداواری عمل میں کیڈمیم (Cadmium) اور کرومیم (Cromium) دونوں متعین کردہ مقدار سے زیادہ ہیں۔ یہ دونوں ہی انسان میں کینسر جیسی موزی بیماری کا باعث سمجھے جاتے ہیں۔[24]

محمد مسکین کی آب بیتی جو صفحہ تین پر بیان کی گئی ہے سے پتہ چل رہا ہے کہ اب بیسٹ وے سیمنٹ ایندھن کے طور پر گاڑیوں کے پرانے ٹائر استعمال کر رہا ہے۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طریقہ کار بڑے پیمانے پر سیمنٹ کی صنعت میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کو ''ٹائر سے حاصل کردہ ایندھن'' (Tire Derived Fuel//TDF) کہا جاتا ہے۔ ٹائروں کے جلنے سے بے تحاشہ آلودگی فضاء میں خارج ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو جلانے کے لیے خاص احتیاتی تدابیر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں بھی صرف دو جگہ پر ایسا انتظام موجود ہے۔ سیمنٹ کلینز (kilns) یعنی سیمنٹ بنانے کے لیے جو بھٹیاں استعمال ہوتی ہیں ان ٹائر کے استعمال سے پیدا ہونے والے تمام کچرے کو جلانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے خطرناک فضلہ ہوا میں خارج ہوتا ہے۔ اگر کام کرتے ہوئے مشینی عمل میں خرابی آتی ہے جس کو ''اپ سیٹ ایوینٹ'' (upset event) کہتے ہیں تو بھی کئی طرح کا نقصاندہ فضلے کا اخراج ہوسکتا ہے۔ جس میں ڈائی آکسینز (dioxins)، فیورانز (furans)، پولی ایرومیٹک ہائڈرو کاربنز (polyaromatic hydrocarbons/PAH) اور پولی کلورینیٹڈ بائیو فینائیلز (polychlorinated biphenyls/PCBs) شامل ہیں۔ ان سب کے بارے میں یقین سے کہا جاتا ہے کہ یہ کینسر، مرد اور عورت کی افزائش نسل کی صلاحیت اور حمل میں نقص پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی نسل کو جنم دینے کی اہلیت، حمل اور چھوٹے بچوں کی نشو ونما پر بھی مضر اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔[25]

گو کہ سیمنٹ کی صنعت کا خیال ہے کہ ٹائر جلانے سے کوئی مسائل نہیں ہیں لیکن دراصل نا تو یہ صنعت ٹائر جلانے کے لیے حفاظتی اقدامات سے لیس ہے اور نا ہی سیمنٹ پیداوار کے عمل میں کوئی خرابی ہوجانے کی صورت میں زہریلے اخراج کو روکنے اور قابو کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔[26]

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) کے مطابق 2012 میں فضائی آلودگی سے سات ملین افراد ہلاک ہوئے۔ ان سات ملین میں سے 3.4 ملین لوگ فضائی آلودگی اور باقی اندرون خانہ فضائی آلودگی کا شکار ہوئے۔[27] ڈبلیو ایچ او کا کہنا ہے کہ ان ہلاکتوں میں سے ایک تہائی ایشیاء کے غریب ممالک میں واقع ہوئیں ہیں جہاں پھیپھڑوں، دل کی بیماریاں اور فالج کے حملے بہت بڑھ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جو عورتیں کوئلے پر کھانا پکاتی ہیں ان کے لیے دھوئیں کی وجہ سے خطرات زیادہ ہیں۔ اب جن علاقوں کے مکین کھانا پکانے کے لیے صرف لکڑی اور کوئلے کا ہی استعمال کر سکتے ہیں اور وہاں سیمنٹ کے کارخانے بھی موجود ہیں۔ جیسا کے حطار میں دن رات جاری فضائی آلودگی ان کی زندگیوں کو اس دنیا میں ہی جہنم بنا رہی ہیں۔

چائنا میں کوئلہ کے گھریلو استعمال کے نقصانات پر ایک سروے کا اہتمام ہوا جس کے مطابق کوئلہ کے استعمال سے مندرجہ ذیل خطرناک بیماریاں پیدا ہوئیں۔[28] پھیپھڑوں کا کینسر، پھیپھڑوں کا سکڑنا، متعدد بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت کا کم ہونا، دمہ، بلغم، شدید بلغم والی کھانسی اور ایسی شریانوں کا بند ہونا جو دل سے پھیپھڑوں کو خون پہنچاتی ہیں۔ کوئلہ کے صرف گھریلو استعمال سے یہ خطرناک

بیماریاں پیدا ہوئی ہیں تو اتنے بڑے پیمانے پر سیمنٹ کی صنعت میں بے تحاشا کوئلے کے استعمال سے اس علاقے میں رہنے والے انسانوں اور دوسرے سانس لینے والے جانداروں کا کیا حال ہوگا؟

بیسٹ وے سیمنٹ بارہا اپنے ''ماحول دوست'' ہونے پر زور دیتی ہے۔ اس حوالے سے کمپنی کو انعامی سرٹیفکیٹ بھی دیے گئے ہیں۔ پھر فضاء کی آلودگی اور پانی کی چوری میں ملوث ہونے کی خبریں کہاں سے آئیں؟[29] ایکسپریس ٹریبیون کی ایک خبر کے مطابق پنجاب حکومت کے انوائرنمنٹ پروٹیکشن ڈیپارٹمنٹ (محکمہ برائے ماحولیاتی تحفظ) نے آٹھ سیمنٹ فیکٹریوں کو جن میں بیسٹ وے سیمنٹ چکوال بھی شامل ہے گرد کی آلودگی، کی روک تھام کے لیے مناسب آلہ جات کے استعمال نہ ہونے پر نوٹس جاری کیا گیا ہے۔ یہ نوٹس پنجاب انوائرنمنٹ پروٹیکشن ایکٹ 2012 کے سیکشن 12 اور سیکشن 16 کے تحت جاری کیے گئے۔ ایکسپریس ٹریبیون کے مطابق بیسٹ وے کو اس بات پر بھی نوٹس دیا گیا ہے کہ ان کی فیکٹری 14 ٹیوب ویل استعمال کرتے ہوئے 340 کیوسک پانی نکال رہی ہے۔ جبکہ اجازت صرف 30 کیوسک پانی نکالنے کی تھی۔

خلاصہ

بیسٹ وے سیمنٹ کی کارگردگی اور اس کے کارخانوں سے پیدا ہونے والی آلودگی سے کئی اہم نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ بین الاقوامی کمپنیاں کردار کے حوالے سے ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتیں۔ سرمایہ داری کا اہم ترین مقصد منافع کمانا ہے جس کے حصول کے لیے اخلاقیات اور اصولوں پر قائم رہنا شاید اتنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ بیسٹ وے سیمنٹ چکوال میں ایسے آلہ جات استعمال نہ کرنا جن سے آلودگی کو کم کیا جاسکے اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ سیمنٹ کے کارخانے اس قسم کے غیر قانونی، ماحول دشمن اقدامات اگر ہمیشہ نہیں تو حسب ضرورت تو کرتے ہی ہوں گے۔ ہمارے ملک میں نگرانی، جانچ پڑتال اور احتساب کا نظام بہت کمزور ہے۔ پہلی دنیا کی سیمنٹ کی صنعت اپنی حکومتوں سے صنعتی آلودگی پر لاگو سخت قوانین اور اصول وضوابط کو یہی کہہ کر کم کروانے کی کوشش کرتی ہے کہ زیادہ سختی کی گئی تو یہ صنعت تیسری دنیا کے غریب ممالک میں منتقل کردی جائے گی جہاں اصول وضوابط کم ہیں یا ان پر عمل درآمد کروانے کا نظام کمزور ہے۔ تو کیا بیسٹ وے گروپ نے بیسٹ وے سیمنٹ اسی لیے پاکستان میں قائم کیا ہے؟ کیا اس کا ہر سال بڑھتا ہوا منافع اس بات کی دلیل نہیں؟

بیسٹ وے سیمنٹ بھارت اور افغانستان بھی سیمنٹ برآمد کررہا ہے۔ یعنی وسائل کا استحصال، ماحولیات کی تباہ کاری اور آبادیوں پر اس کے اثرات اور تکالیف پاکستانی عوام برداشت کریں اور بیسٹ وے نا صرف بے تحاشا منافع کمائے بلکہ عزت اور احترام کی نظر سے بھی دیکھی جائے کیونکہ وہ اس ملک میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کررہے ہیں۔

بقول بیسٹ وے گروپ اس نے انسانی فلاح کے لیے بیسٹ وے فاؤنڈیشن بنائی ہے جو پاکستان میں تعلیم، صحت اور قدرتی آفات میں آبادیوں کو مدد فراہم کرتی ہے۔ جو صنعت اتنے بڑے پیمانے پر آلودگی پیدا کرتی ہو، تو پھر اس کے مداوے کے لیے کچھ لوگوں کی مدد کرکے خود کے لیے ہمدردیاں حاصل کرنا کیا بے ایمانی نہیں؟ ہزاروں لوگ سانس، دل اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہیں یا جن کی اولاد کی نشو ونما صحیح نہیں، کیا وہ اس خیرات کو اپنے نقصان کا ازالہ سمجھیں؟

گلوبلائزیشن کی ایک اہم ترین پالیسی آزاد تجارت ہے۔ جس کا مقصد سرمایہ کاری کو فروغ دینا ہے۔ گلوبلائزیشن کے تحت ہی ڈی ریگولیشن اور نجکاری کو تیسری دنیا کے ممالک میں فروغ دیا جارہا ہے۔ سرمایہ کاری یقیناً کارپوریٹ شعبہ ہی کرتا ہے۔ گلوبلائزیشن حکومتی پالیسیوں کے ذریعے معاشرے میں یہ تصور عام کرتا ہے کہ کارپوریٹ شعبہ ترقی کے حصول کے لیے معاشرے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ جسے سرمایہ کاری کرنے کے لیے حکومتیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔ جس میں ٹیکس کی چھوٹ بھی شامل ہے۔ ان بڑی بڑی کارپوریشنوں کے لیے ہی ڈی ریگولیشن اور نجکاری پالیسی پاکستان جیسے غریب ممالک میں زبردستی لاگو کروائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس مضمون میں دیکھا کہ سرکاری ملازمت ختم ہونے پر مزدور طبقہ کس مشکل سے روٹی کماتا ہے۔ صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولتیں اس کی دسترس سے باہر ہوجاتی ہیں۔ یعنی غربت بڑھانے میں ان کارپوریشنوں کا پورا پورا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایک اہم پہلو یقیناً ماحولیات کا ہے۔ ان کارپوریشنوں کی وجہ سے ایک طرف پاکستان موسمی بحران کا سامنا کررہا ہے۔ دوسری طرف ان کی پیدا کی گئی آلودگی کی وجہ سے زمین کی زرخیزی متاثر ہوکر خوراک پیدا کرنے سے قاصر ہوتی جارہی ہے، آبی حیاتیات جو ہماری خوراک کا اہم جز ہیں زہریلی ہوتی جارہی ہیں، آلودگی سے انسانی صحت شدید متاثر ہورہی ہے اور تندرست وتوانا مزدور بستیاں مختلف امراض کا شکار ہوکر معاشرے پر بوجھ بنتی جارہی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میں صنعتی آلودگی کی وجہ سے انسانوں اور دیگر حیاتیات پر پڑنے والے کیمیائی اثرات پر سائنسی تحقیق نا ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے نقصانات کا درست اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق چین میں شہری ترقی اور اس سے ہونے والی آلودگی سے اموات، پیدائشی نقائص پر چینی حکومت کے سالانہ 300 بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔[30] ایسی تحقیق جو کہ تعمیری سرگرمیوں کے سماجی اثرات کا جائزہ پیش کرتی ہو پاکستان میں نہیں ہوتی جسے فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ ہم کہہ سکیں کہ سرمایہ کاری کی بدولت ترقی ہوئی یا ہم اور پیچھے چلے گئے؟

ایسے شعبوں میں سرمایہ کاری جن سے بڑے پیمانے پر آلودگی پھیل رہی ہے اور جس کے نتیجے میں انسان، ماحول اور جاندار پر کئی طرح کے مضر اثرات پڑ رہے ہیں تو باوثوق تحقیق کرانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ فی الحال نجکاری سے نا صرف مزدوروں سے ان کی روزی چھینی جارہی ہے بلکہ اس کی وجہ سے ان حکومتی اداروں کو بھی کمزور کیا جارہا ہے جو کہ کارپوریٹ شعبے کے لیے مسائل کا باعث بن سکتے ہوں۔ مثلاً جانچ پڑتال کرنے والے ادارے اور قوانین پر عمل درآمد کرانے والے ادارے جو کارخانوں سے ہونے والی آلودگی، مزدوروں کے کام کی جگہ پر ان کی صحت وتحفظ کے لیے کیے گئے انتظامات کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔

ہماری حکومت سرمایہ داروں کو پورے جوش وخروش سے ملک میں سرمایہ کاری کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ ان حالات میں مشکل ہے کہ حکومت ایسے اقدامات اٹھائے جن سے عوام اور ماحول کا تحفظ ممکن ہو۔ یہ اقدامات ایک باشعور عوام ہی کرسکتی ہے۔ عوام کی ذمہ داری ہے کہ ایسے طرز حکومت کو عملی جدوجہد کے ذریعے نافذ کریں جو دراصل عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے فیصلہ سازی عوام کے اختیار میں دیتی ہو۔ اس بنیادی تبدیلی کے بغیر استحصالی قوتوں کے ظلم سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

حوالہ جات

1. Bestway. "Bestway Cement Limited announces acquisition of Lafarge Pakistan Cement Limited." Thursday July, 2014, Accessed from www.bestway grvop.co.uk/bestway-news/883
2. Martin, Sean "Co-op Group sells Pharmacy chain to Bestway for £620m." International Business Times, July 18, 2014.
3. Butler, Sarah. "Business founded by Tory donor buys Co-op pharmacies for £620m." The Guardian, Friday 18 July, 2014. Accessed from http://www.theguardian.com/business/2014/jul/18/bestway-buys-co-operative-pharmacies-tory-donor
4. Bestway Cement. "Corporate Profile." Accessed from http://www.bestway.com.pk/profile.html
5. Ibid.
6. Fatima, Gohar and Wali-ur-Rahman. "A review of privatization policies in Pakistan." Interdisciplinary Journal of Contemporary Research in Business. January 2012, Vol 3, No. 9. Accessed from http://www.journal-archieves14.webs.com/1017-1032.pdf
7. Bestway group. "Vision Statement." Accessed from http://www.bestwaygroup.co.uk/responsibility/bestway-foundation
8. Afzal, Shahzad et al. "Building to Standard in Pakistan: Standardization in the Crucial Cement Sector." Standardization News, November/December 2012. Accessed from http://www.astm.org/sn/features/building-to-standard-in-pakistan-nd12.html
9. Bestway Cement. "BCL's profit after tax increases to Rs 3.06 billiion." 29 September, 2012. Accessed from www.bestway.com.pk/news.html
10. Bestway Cement Limited. "Annual Report. 2012-13." Accessed from www.bestway.com.pk/news.html
11. Bestway Cement. "Corporate Profile." Acceseed from www.bestway.com.pk/profile.html

12۔ یہ لکھنا ضروری ہے کہ راقم ہری پور کا رہنے والا ہے اور ان سارے حالات کو بذات خود دیکھتا رہا ہے۔ یہ معلومات نا صرف راقم کی اپنی ہیں بلکہ گاؤں والوں سے مختلف اوقات میں انٹرویوز اور بات چیت سے حاصل کی گئی ہے۔

13. Williamson, John. "The Washington Consensus as policy prescription for development." Institute for International Economics, January 13, 2004. Accessed from http://www.iie.com/publications/papers/williamson0204.pdf
14. Earth Justice. "EPA adopts strong protections against air pollution from cement kilns." August 9, 2010. Accessed from http://earthjustice.org/news/press/2010/epa-adopts-strong-protections-against-air-pollution-from-cement-kilns
15. SA, Meo. "Health hazards of cement dust." Saud Med J. 2004 Sep; 25(9): 1153-9. Accessed from http://www.ncbi.nlm.nih.gov/pubmed/15448758
16. Edwards, Peter. "Global cement emissions standards." Global Cement Magazine, February 21, 2014. Accessed from http://www.globalcement.com/magazine/articles/845-global-cement-emissions-standards
17. Wisconsin Department of Health Services. "Sulfur Dioxide." Accessed from http://www.dhs.wisconsin.gov/eh/chemfs/fs/SulfurDioxide.htm
18. United States Environmental Protection Agency. "Cement Manufacturing Enforcement Initiative." from http://www2.epa.gov/enforcement/cement-manufacturing-enforcement-initiative
19. Ibid.
20. Ibid.
21. U.S. Environmental Protection Agency. "Mercury environmental effects: fate and transport and ecological effects of Mercury." Accessed from http://www.epa.gov/mercury/eco.htm
22. New Mexico Department of Health. "Mercury in the environment and health effects: understand where Mercury can be found and how to protect yourself." Accessed from https://nmtracking.org/media/cms_page_media/165/Mercury%20General2.7.13.pdf
23. Edwards, Peter. "Global cement emissions standards."
24. Wali, Fazal et al. "Trace elements concentration in various brands of portland cement environmental and occupational health and safety concerns: a comparative study." 2nd International Conference on Energy, Environment and Sustainable Development (EESD2012), MUET Jamshoro, Pakistan, 27-29, 2012. Accessed from http://www.researchgate.net/profile/Fazal_Wali/publication/233937407_TRACE_ELEMENTS_CONCENTRATION_IN_VARIOUS_BRANDS_OF_PORTLAND_CEMENT_ENVIRONMENTAL_AND_OCCUPATIONAL_HEALTH_AND_SAFETY_CONCERNS_A_COMPARATIVE_STUDY/links/09e4150d287cab5abe000000
25. Risk Assessment Forum, U. S. Environmental Protection Agency. "Guidelines for developmental toxicity risk assessment." December 5, 991 EPA/600/FR-91/001. Accessed from http://ofmpub.epa.gov/eims/eimscomm.getfile?p_download_id=4560
26. Energy Justice Network. "Tire Incineration: protect the air you breathe, stop tire incineration." Accessed from http://www.energyjustice.net/tires
27. Rhodan, Maya. "Heart disease, stroke led to about 80% of

29. Malik, Sonia. "Dust level: EPD issues notices to eight cement factories." The Express Tribune, August 4, 2012. Accessed from http://tribune.com.pk/story/417311/dust-level-epd-issues-notices-to-eight-cement-factories/
30. Rhodan, Maya. "Heart disease, stroke led to about 80% of deaths." Time, March 24, 2014. Accessed from time.com/36391/air-pollution-7-milliion-who/
28. Zhang, Jurteng and Smith, Kirk, R. "Household air pollution from coal and biomass fuels in China: Measurements, health impacts, and interventions." Environmental Health Perspectives, June 2007, 115(6): 848–855. Accessed from http://www.ncbi.nlm.nih.gov/pmc/articles/PMC1892127/#!po=14.8649

پاکستان میں نجکاری کے اثرات

گاؤں حطار کا رہائشی محمد مسلم مستحکم سیمنٹ فیکٹری کا ملازم تھا، نجکاری کی وجہ سے اس کی ملازمت ختم ہوگئی۔ اس کی عمر 50 سال سے زیادہ تھی۔ اس کے 10 بچے تھے، لڑکیاں بڑی تھیں اور لڑکے چھوٹے تھے۔ محمد مسلم کے گھر کا تمام دارو مدار اس کی ملازمت پر تھا۔ جب اس کی ملازمت ختم ہوئی اس کی صحت اچھی نہیں تھی وہ سخت کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ محمد مسلم جب فیکٹری کا مستقل ملازم تھا اس کا علاج کمپنی کی طرف سے مفت ہو رہا تھا۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد وہ مہنگا علاج برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

فیکٹری کی طرف سے جو پیسے اسے ملے ان سے محمد مسلم نے تین بھینسیں خرید لیں اور ان کا دودھ بیچ کر اپنے بچوں کا پیٹ پالنے لگا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی صحت بہت خراب ہوگئی اور اس کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ اس کے اہل خانہ نے بھینس، یہاں تک کہ گھر کا سامان بیچ کر علاج کروایا، لیکن بیماری پر قابو نہیں پایا جاسکا اور محمد مسلم فوت ہوگیا۔

اس کے مرنے سے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ بچے جو پہلے اسکول جاتے تھے انھوں نے اسکول چھوڑ کر مزدوری شروع کردی اور لوگوں کے گھروں اور ہوٹلوں میں کام کرنے لگے۔ اتنی محنت کے باوجود بھی وہ اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی پوری نہ کر سکے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا گھر سے باہر نکلنا اور کام کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جو عورتیں باہر جاتی ہیں اور کام کرتی ہیں ان کے بارے میں غیر اخلاقی باتیں کی جاتی ہیں۔ اس ڈر سے اس کے بیوی، بچوں نے گاؤں چھوڑ دیا اور دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ وہاں پر اس کی بیوی بچے سب کام کرتے ہیں پھر بھی ان کے مالی حالات بہتر نہیں ہیں۔

جب محمد مسلم مستحکم سیمنٹ میں کام کرتا تھا اس کے گھریلو حالات کافی اچھے تھے۔ بچے اسکول جاتے تھے اور خاندان خوشحال تھا۔ اگر محمد مسلم کو نجکاری پالیسی کے تحت جبری ملازمت سے برطرف نہ کیا جاتا، اس کی موت فیکٹری میں ملازمت کے دوران ہوتی تو اس کے بیٹے کو اس کی جگہ پر پکا ملازم رکھ لیا جاتا۔ یہ فیکٹری کا قانون تھا کہ اگر کوئی مزدور فوت ہو جاتا یا ریٹائر ہو جاتا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے کو نوکری مل جاتی۔ مزدور یونین نے اس قانون کو سختی سے لاگو کیا ہوا تھا۔ اگر نجکاری کی ظالمانہ پالیسی لاگو نہ ہوتی اور محمد مسلم کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو اس کی جگہ ملازمت مل جاتی تو اس خاندان پر اتنے مصیبتوں کے پہاڑ نہ ٹوٹتے، کیونکہ محمد مسلم کے اہل خانہ کو فیکٹری کی طرف سے اس کی موت پر گرانٹ کی صورت میں کافی رقم ملتی اور اس کے بچوں کو فیکٹری کی طرف سے مفت تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یوں یہ خاندان دو وقت کی روٹی عزت کے ساتھ کھا سکتا تھا۔

یہی حال دوسرے ہزاروں مزدوروں کا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور ان کے خاندان نجکاری پالیسی کی وجہ سے دربدر ہوگئے ہیں۔ جب فیکٹری حکومت کی ملکیت تھی اس وقت مزدوروں کو بہت سی مراعات حاصل تھیں ان میں مفت تعلیم، صحت، رہائش، اچھی تنخواہ اور اضافی بونس، سالانہ چھٹیوں کے علاوہ بیماری کی چھٹیاں وغیرہ۔ اب فیکٹری کی نجکاری کے بعد یہ تمام مراعات اور سہولتیں ختم کردی گئیں۔ جس کی بدولت اپنی محنت سے کما کر کھانے والے اب بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان مزدوروں کے بچے اب تعلیم حاصل نہیں کررہے، جو بچے پڑھ رہے ہیں وہ بھی غیر معیاری تعلیم حاصل کر رہے ہیں کیوں کہ اب مزدور کے بس میں بچوں کی اچھی تعلیم نہیں ہے۔ بہت سے مزدوروں کے بچے اب محنت مزدوری کررہے ہیں۔ فیکٹری کی نجکاری سے پورے علاقے کی معیشت پر بہت برے اثرات پڑے ہیں۔ ایک طرف بہت سے مزدور نفسیاتی مریض بن گئے ہیں اور دوسری طرف علاقے میں بہت سے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن میں نشے کی عادت اور جرائم میں اضافہ شامل ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر مزدور کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟

اس کی وجہ ایک خاص سرمایہ دار طبقہ ہے جس کے پاس بے شمار دولت اور وسائل ہیں اس نے ہماری حکومتوں سے مل کر ایسے قوانین اور پالیسیاں بنائی ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے منافع کے لیے وسائل پر قبضہ اور اجارداری کو مزید مضبوط اور ہمیشہ کے لیے قائم رکھنا چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کے منافع میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ مزدور کا استحصال کرتا ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور سے بہت زیادہ کام لیا جاتا جس کے بدلے اس کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اسی لیے سرمایہ دارانہ نظام ظلم پر مبنی نظام ہے اس کے خلاف تمام مزدور، کسان دوست تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر اکھٹا ہو کر اس کے خلاف جدوجہد کرنی ہے، کل نہیں آج کرنی ہے!

پائیدار ترقی نجکاری کے شکنجہ میں!

تحریر: عذرا طلعت سعید

گزشتہ دو عشروں میں زمین اور اس کے باسیوں کو یکے بعد دیگرے کئی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان بحرانوں میں معاشی بحران، توانائی کا بحران، خوراک کا بحران اور ان سب سے بڑھ کے ماحولیاتی بحران شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اور دیگر حیات کو درپیش بحران دراصل اس استحصالی طریقے کار کا نتیجے ہیں جو کہ سرمایہ دار پیداواری نظام میں پنہاں ہے۔ ہمیں اس بات پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ پیداوار کی صنعتی اور مشینی شکل جو کہ سرمایہ دارنہ نظام کی روح ہے، مکمل طور پر رکازی ایندھن پر انحصار کرتی ہے اور کرہ ارض کے ماحولیاتی نظام کی تباہی کی وجہ رکازی ایندھن کے جلنے سے مسلسل خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر کاربن گیسیز ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام جب تک زیادہ سے زیادہ پیداوار نہیں کرتا اس کے منافع میں بڑھوتری ممکن نہیں۔ زائد پیداوار کا شکار سرمایہ دارانہ نظام خاص کر کے توانائی کے بحران کے ہاتھوں اپنے کم ہوتے ہوئے منافع کے نتیجے میں بدحواس ہو چکا ہے۔ منافع کو بڑھانے اور خام مال، مزدور اور منڈی پر قابو پانے کے لیے ایک طرف نیو لبرل پالیسوں کا سنگدلانہ نفاذ کیا جارہا ہے جبکہ دوسری طرف استعماری قوتوں کی طرف سے جنگیں بھی مسلط کی جارہی ہیں تا کہ وہ دنیا کے قدرتی وسائل، منڈیوں اور مزدوروں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔

نیو لبرل پالیسیوں کا نفاذ سرمایہ دار ممالک اور ان کے بنائے ہوئے دیگر بین الاقوامی سرکاری اداروں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس میں امریکہ، کینیڈا اور یورپی یونین کے کئی ممالک خاص کر کے برطانیہ، جرمنی، فرانس اور اٹلی پیش پیش رہے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پالیسویں کو نافذ کرنے میں تیسری دنیا کے ممالک کی سرکار اور اشرافیہ طبقہ کا کردار کلیدی ہے۔ نیولبرل پالیسیوں کے تحت کمزور گروہوں کا قتل عام ساری دنیا میں ایک معمول بن چکا ہے۔ اس خوف سے کے ان مظالم کے خلاف آبادیوں کی طرف سے ردعمل آئے، فوجی اور نیم فوجی دستوں کو علاقہ پر مسلط کرنا ایک عام روش بن چکی ہے۔ اس طرح بین الاقومی اداروں اور منافع خور کمپنیوں کے مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جارہا ہے۔ سامراج کے کالے ارادوں کی عملی شکل افغانستان اور عراق جیسے ملکوں پر قبضہ ہے جس کے پس پردہ تیل کے کنوں پر قبضہ اہم ترین پہلو ہے۔

تیل کے علاوہ کئی طرح کے قدرتی وسائل پر قبضہ کے طریقہ مسلسل جاری ہیں مثلاً سونے کی کانیں، گھنے جنگلات، بیش بہا آبی وسائل اور اب تیزی سے بڑھتے ہوئے زمینی قبضے ملکی اور غیر ملکی بین الاقوامی سرمایہ دار اور ان سے ملے ہوئے مقامی جاگیردار اور سرمایہ دار کی حوص کا نتیجہ ہیں۔ وسائل پر قبضہ کے لیے آبادیاں، خاص کر کے دیہی اور قدیم (indigenous) آبادیاں بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی پامالی کا سامنا کررہی ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والے مثلاً کسان، ماہی گیر، چرواہے، مال مویشی پالنے والے، سب کو ان کے مقامی علاقوں سے دھکیلا جارہا ہے اور ان گروہوں کا پیداواری وسائل پر سے اختیار کم یا بالکل ختم کردیا گیا ہے۔ وہ غذائی قلت اور بھوک کا شکار ہیں۔ توانائی، خوراک، رہائش اور نقل وحمل کے علاوہ دیگر ضروری اشیاء کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافے کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان شدید عدم مساوات پیدا ہو چکا ہے۔

سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اس کے اثرات سرمایہ دار ممالک کی عوام پر بھی واضح اثر چھوڑ رہے ہیں۔ ان اثرات کے خلاف مزاحمت امریکہ کے شہر نیو یارک میں اکیوپائے موومنٹ (Occupy Movement یعنی ''قبضہ کرو تحریک'' کی شکل میں نظر آئی۔ اس تحریک نے اس نکتہ کو ابھارا کہ دنیا کے 99 فیصد عوام کو سرمایہ داری نظام نے غربت اور مفلسی جبکہ صرف ایک فیصد اشرافیہ دنیا کی زیادہ تر دولت اور دیگر وسائل پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔

اس وسیع پیمانے پر عدم مساوات نے گو کہ ہر شعبہ کے مزدوروں پر بہت منفی اثرات چھوڑے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نجکاری اور آزاد تجارت کی استحصالی پالیسیوں کے سب سے زیادہ منفی اثرات عورتوں پر پڑے ہیں۔ ایک طرف ڈی ریگولیشن اور نجکاری کی پالیسیوں کے تحت مزدوروں کو بے روزگار یا پھر ان کی تنخواہوں کو کم سے کم کیا جاتا ہے تو مزدور خود استحصال اور ظلم کا شکار ہو کر اپنے گھر کے اندر عورتوں کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری طرف انہی حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے مہنگائی کے بوجھ تلے عورت اپنے بچوں اور گھرانے کی بنیادی ضرورتوں خاص کر کے خوراک کو کبھی پورا کر پاتی ہے اور کبھی نہیں۔

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ عورت خود بھی مزدور ہے۔ عورت چاہے کارخانے میں کام کرتی ہو، گھریلو ملازمہ ہو، کسان ہو یا ماہی گیر وہ بھی نجکاری اور آزاد تجات کی پالیسیوں کا شکار ہے۔ ایک طرف کام کے گھنٹے بڑھائے جارہے ہیں اور دوسری طرف اجرت میں کمی کی جارہی ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے اس انتشار کے نتیجہ میں عورتوں پر تشدد کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالمگیریت پر مبنی نجکاری، ڈی ریگولیشن اور لبرلائیزیشن کی مسلط کردہ پالیسوں کے نتیجے میں عورتوں پر ہونے والے تشدد میں اضافہ ہوا ہے چاہے وہ گھر ہو، کام کرنے کی جگہ ہو یا پھر معاشرے کے دیگر حصے۔ ان حالات میں ریاستی اور غیر ریاستی عناصر عورتوں پر ہونے والے مظالم کے برابر کے ذمہ دار ہیں۔

پائیدار ترقی کا ڈھانچہ

کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانی تاریخ کا نازک موڑ ہے۔ ایک طرف کرہ ارض شدید ماحولیاتی بحران سے گزر رہی ہے اور دوسری طرف اس کے باسی معاشی حوالے سے مندرجہ بالا بیان کیے گئے کئی مسائل کا شکار ہیں۔ لیکن اس غیر متوازن حالات میں عوام اور سرکار کے لیے ایک منفرد اور اجتماعی موقع بھی ہے۔ 2000 میں عالمی ترقی کے لیے کچھ اہداف طے کیے گئے تھے جن کو ملینیم ڈیولپمنٹ اہداف (Millenium Development Goals/MDGs) کہا جاتا ہے۔ ان اہداف کو تمام ممالک نے 2015 تک حاصل کرلینا تھا جو کہ دراصل بہت کم پیمانے پر حاصل ہوسکا ہے. ایشیائی ترقیاتی بینک کے مطابق پاکستان 2015 کی مقررہ مدت تک MDGs (ایم ڈی جیز) کے 22 اشاروں میں سے صرف چار حاصل کر پائے گا۔[1] اس وقت پوری دنیا کی سرکار اقوام متحدہ کی رہنمائی میں 2015 کے بعد کے لیے ترقیاتی اہداف پر مذاکرات کے ایک خاص طریقہ پر مبنی سلسلے میں مصروف ہے۔ ان ترقیاتی اہداف کو ''پائیدار ترقی کے اہداف'' (Sustainable Development Goals/SDGs) یا پھر ''پوسٹ 2015'' یعنی ''2015 کے بعد'' کا نام دیا جارہا ہے۔ پوسٹ 2015 مذاکرات کا مقصد یہ ہے کہ نا صرف آئندہ 15 سال کے لیے ترقی کے اہم ترین اہداف کا تعین کیا جائے بلکہ ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے عالمی سطح سے لے کر قومی و مقامی سطح تک انتظامی ڈھانچے کے لیے لائحہ عمل بھی تشکیل دیا جائے۔ ترقی کے اہداف کی نشاندہی کے حوالے سے مذاکرات میں اہداف کے حصول کے لیے ضروری وسائل (means of implementation) پر بھی بحث و مباحثہ جاری ہے۔

پائیدار ترقی کے اہداف کی نجکاری

آج جبکہ کرہ ارض شدید موسمی بحران کی وجہ سے پے در پے جھٹکوں کے نظر ہورہی ہے اور عدم مساوات عروج پر ہے تو اس وقت سمجھ داری اور ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے ایسے لائحہ عمل کو تشکیل اور لاگو کرنے کی ضرورت تھی جو درپیش بحرانوں سے نمٹنے اور ان کے روک تھام کو یقینی بناتا، لیکن پائیدار ترقی کے اہداف کی تشکیل کے لیے جن کرداروں کو اہمیت دی جارہی ہے وہ سرمایہ دار طبقہ اور ان کی بین الاقوامی کمپنیاں ہیں۔ حد یہ ہے کہ اب پائیدار ترقی کو ''پائیدار ترقی کے اہداف کی نجکاری'' کہا جارہا ہے۔ یہ لقب کیوں دیا گیا؟

پائیدار ترقی کے اہداف کے حصول کے مختلف عوامل

پائیدار ترقی کے اہداف طے کرنے کے لیے کئی گروہ حصہ لے رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے عوامی گروہوں کو مذاکرات کرنے کے لیے نو گروہ جن کو میجر گروپس (major groups) کہا جاتا ہے میں تقسیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

1۔ مزدور
2۔ کسان
3۔ عورتیں
4۔ نوجوان
5۔ قدیم لوگ (indigenous people)
6۔ غیر سرکاری تنظیمیں (این جی اوز)
7۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کمیونٹی
8۔ مقامی حکومتیں
9۔ بزنس اور انڈسٹری (صنعت اور تجارت)

میجر گروپوں کے ہر گروہ کو منظم ہوکر جغرافیائی علاقوں کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنے حلقوں سے ان کی نظر میں پائیدار ترقی کے اہم ترین اہداف کی نشاندہی کرکے اقوام متحدہ کو پیش کرنی ہیں۔

اس کے علاوہ 2010 میں ریو +20 کانفرنس سے نکلے ہوئے مسودہ ''دی فیوچر وی وانٹ'' یعنی ''وہ مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' نے لازم کیا کہ پائیدار ترقی کے اہداف کی نشاندہی کے لیے دو پلیٹ فارم بنائے جائیں:

1۔ انٹر گورنمنٹل ورکنگ گروپ جسے ''اوپن ورکنگ گروپ'' کا نام دیا گیا۔
2۔ انٹر گورنمنٹ ہائی لیول پولیٹیکل فورم (High Level Political Forum/HLPF)۔ اوپن ورکنگ گروپ کا مقصد یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی 68 ویں جنرل اسمبلی میں نئے ترقیاتی اہداف کی نشاندہی پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کے علاوہ HLPF (ایچ ایل پی ایف) کا مقصد پائیدار ترقی پر سیاسی رہنمائی، سوجھ بوجھ اور تجاویز پیش کرے۔ اقوام متحدہ کے تحت الگ الگ طریقوں سے پائیدار ترقی کے اہداف پر مشاورت اور بحث و مباحثہ ہورہا ہے۔ ان میں شامل ہیں:[2]

1۔ اوپن ورکنگ گروپ۔
2۔ ہائی لیول پولیٹکل فورم۔
3۔ اقوام متحدہ کے 2015 کے بعد کے ترقیاتی ایجنڈے پر سسٹم ٹاسک ٹیم۔
4۔ قومی، علاقائی اور تھیمیٹک (موضوعی) مشاورت۔
5۔ سسٹینیبل ڈیولپمنٹ سالوشنز نیٹ ورک (Sustainable Development Solutions Network/SDSN: SDSN) کا مقصد ہے کہ سائنسی اور تیکنیکی مہارت کو تدریسی اداروں، سول سوسائٹی اور نجی شعبے سے متحرک کریں۔
6 ۔ اقوام متحدہ کا عالمی میثاق (United Nations Global Compact/UNGC) جو کہ 30 ماہرین پر مبنی ہے۔ اس کمیٹی کا کام ہے کہ وہ پائیدار ترقی کی ماحولیاتی ضروریات کے لیے مختلف ترجیحات پیش کرے۔[3] یہ

کارپوریٹ شعبے کی طرف سے ایک رضاء کارانہ عمل ہے جس کے تحت کچھ اہم مسائل مثلاً انسانی حقوق، مزدور، ماحول اور کرپشن کے خاتمے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ شعبہ 10 اصولوں کو اپنے کاروبار میں شامل کرے گا۔

7۔ ترقی کے مالیاتی معاملات کو دیکھنے کے لیے ماہرین کی کمیٹی (ایکسپرٹ کمیٹی آن فائنانسنگ فار ڈیولپمنٹ)۔

پائیدار ترقی کے اہداف اور کارپوریٹ شعبہ

اوپر بیان کیے گئے عوامل میں بین الاقوامی منافع خور کمپنیاں جن کو اجتماعی طور پر کارپوریٹ شعبہ کہا جاتا ہے کس حد تک شرکت کر رہا ہے؟ اس موضوع کو لو پنجوٹ (Lou Pingeot) نے ایک رپورٹ میں مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔[4]

اس سے پہلے کہ ہم کارپوریٹ شعبہ کی پوسٹ 2015 مذاکرات میں شراکت کا جائزہ لیں، ضروری ہے کہ عالمی کارپوریٹ شعبہ اور اس سے جڑی کلیدی تنظیموں کو سمجھیں جو کہ ترقیاتی اہداف کی منصوبہ سازی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم ورلڈ ایکانامک فورم (World Economic Forum/WEF) ہے۔

ورلڈ ایکونومک فورم کا انعقاد 1971 میں ہوا۔ اس کی ممبر شپ میں دنیا کی ایک ہزار سب سے نمایاں اور امیر ترین کمپنیاں ہیں۔ ان کمپنیوں میں سے زیادہ تر کا ٹرن اوور (turnover) عموماً پانچ ہزار بلین امریکی ڈالر سے زائد ہوتا ہے۔[5] WEF (ڈبلیو ای ایف) کے ممبران میں نیسلے، کوکا کولا، نوارٹس، سیمنز اے جی، بائیر، ای این آئی، گوگل انکارپوریٹڈ اور ان جیسی دیگر بڑی بڑی کمپنیاں شامل ہیں۔ ڈبلیو ای ایف کے مطابق وہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو کہ سرکاری اور نجی شراکت داری کے بلبوطے دنیا کی حالت بہتر کرنے کا عہد کرتا ہے۔ ڈبلیو ای ایف میں سینٹر فار پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ (PPP) ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ کاروباری شعبہ، سول سوسائٹی اور سیاسی کارکنان/ادارے (اتھارٹیاں) کے ملاپ سے ایسے منصوبے تشکیل دیتا ہے جو معاشرتی اور معاشی مسائل کا جواب ہوں۔ مثلاً ڈبلیو ای ایف کی ویب سائٹ کے مطابق صحت سے لے کر بھوک جیسے مسائل کے لیے پروگرامز ترتیب دیے گئے ہیں۔

پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ ایک ایسا ایجنڈا ہے جس کو فروغ دینے میں ڈبلیو ای ایف کا نمایاں کردار نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈبلیو ای ایف نے 2005 میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں PPP (پی پی پی) کی اہمیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔[6] اس رپورٹ میں نکاسی آب اور صفائی ستھرائی کے نظام (Water and Sanitation) میں پی پی پی کے کردار پر تحقیق اور سوچ بچار پر زور دیا گیا ہے اور کارپوریٹ شعبہ کے عمل دخل کو فروغ دینے کے لیے تدابیر بھی پیش کی گئیں ہیں۔ خاص کر کے نشاندہی کی گئی ہے کہ پانی کے حصول کے لیے محصولات کا اضافہ ایک ضروری امر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ پانی کے حوالے سے پالیسی سازی کرنے والے اداروں اور پانی کی خدمات فراہم کرنے والے اداروں کو الگ الگ ہونا چاہیے۔ پانی کی فراہمی اگر نجی شعبہ کو دے دی جائے تو اس سے پانی کی قیمت میں مقابلہ ہوگا اور اس طرح قیمت پر حکومتی ریگولیشن یا ضوابط کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں کارپوریٹ شعبہ ایک طرف محصولات میں اضافے کی تجویز دے رہا ہے جس کا بوجھ عوام پر آئے گا اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے کسی بھی روک ٹوک کو ختم کروانا چاہ رہا ہے۔ تاکہ پانی کی فراہمی پر قیمت اپنی مرضی سے طے کر سکے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی اشارہ ہے کہ سرکار کو پالیسی سازی کے عمل تک محدود رہنا چاہیے اور منڈی میں خرید و فروخت کا حق صرف نجی شعبے کو دے دینا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈبلیو ای ایف ایک ایسا ادارہ ہے جو کہ دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار کمپنیوں کے رجحانات کو پالیسی بحث و مباحثے پر اثر انداز ہونے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اوپن ورکنگ گروپ کا پائیدار ترقی پر زیرو ڈرافٹ جو 30 جون 2014 میں پیش کیا گیا، میں انسانی حقوق میں اہم ترین ''پانی کا حق'' شامل نہیں تھا۔ اس مسودہ میں پانی پر اہداف میں انسانی ضرورت اور ماحولیات کی صحت یابی کو اولین حیثیت نہیں دی گئی اور نہ ہی عوامی شراکت، غیر جانب داری اور جوابدہی جیسے ضروری نکات کو یقینی بنایا گیا۔[7]

ڈبلیو ای ایف اقوام متحدہ کی طرف سے پائیدار ترقی کے اہداف کے لیے جاری کئی پروگراموں میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ مثال کے طور پر ڈبلیو ای ایف اقوام متحدہ کے دو پلیٹ فارمز SDSN (ایس ڈی ایس این) اور UNGC (یو این جی سی) کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈبلیو ای ایف کی کئی ممبر کمپنیاں اور ادارے الگ الگ اقوام متحدہ کے دیگر پلیٹ فارموں میں شامل ہیں۔ مثلاً بائیر، لیڈ (LEAD) کا حصہ ہے اور سیمنس ایس ڈی ایس این کا حصہ ہے۔ لیڈ گلوبل میثاق کی ان متحرک کمپنیوں پر مبنی ہے جو کہ کارپوریٹ شعبہ کے لیے 10 اصولوں کے حصول کے لیے لائحہ عمل پر زور شور سے حصہ لے رہی ہیں۔[8]

میجر گروپس میں سے ایک بزنس اینڈ انڈسٹری ہے جو ترقیاتی اہداف کی نشاندہی میں بھرپور حصہ لے رہی ہے۔ اس گروپ کی رہنمائی انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس (International Chamber of Commerce/ICC) کر رہا ہے۔ ICC (آئی سی سی) کے ممبران 120 سے زائد ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ادارے کا کہنا ہے کہ وہ کئی طرح کی سرگرمیوں میں کئی اداروں کے ساتھ کام کرتا ہے جن میں اقوام متحدہ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) اور ورلڈ انٹلیکچوئل پروپرٹی آرگنائزیشن (World Intellectual Property Organization/WIPO) شامل ہیں۔ آئی سی سی عالمی کاروباری ادارہ ہے اور اس حیثیت میں اس کے ڈبلیو ٹی او سے ایک قریبی رشتہ ہے۔ جس کے ذریعے وہ

ڈبلیو ٹی او کو اس کے تجارت سے منصوب کام میں مدد فراہم کرتا ہے۔ آئی سی سی ذہنی ملکیت کو فروغ دیتا ہے کیونکہ کہ اس کے خیال میں ذہنی ملکیت کے تحفظ سے بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے بہتر کاروباری مواقع اور ٹیکنالوجی کی منتقلی (technology transfer) کے لیے بہتر ماحول فراہم ہوتا ہے۔[9]

پوسٹ 2015 مذاکرات کے لیے آئی سی سی کے مطابق پائیدار ترقی کے موضوع پر کام کرنے کے لیے 15 عالمی اور شعبہ جات پر مبنی کاروباری اداروں نے گلوبل بزنس الائنس کو تشکیل دیا ہے۔[10] جن میں ایکوافیڈ، انٹرنیشنل کاؤنسل آف کیمیکل ایسوسی ایشنز، انٹرنیشنل فرٹیلائزر انڈسٹری ایسوسی ایشن اور آئی سی سی وغیرہ شامل ہیں۔ (فیگر 1)

گلوبل بزنس الائنس (فیگر 1)

Danielou. Morgane. "Role of Business Groups in Policy Coherence Action Agenda Lessons from Public-Private Dialogue in Developing Countries," International Fertilizer Industry Association.

گلوبل بزنس الائنس میں پائے جانے والے اداروں کو تین مختلف قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلے وہ ادارے ہیں جو مخصوص کاروباری شعبوں پر مبنی بین الاقوامی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یعنی وہ کمپنیاں جو مخصوص مصنوعات یا خدمات کا کاروبار کرتی ہیں مثلاً کیمیائی کھاد، پانی، کان کنی اور دھات، زرعی بائیو ٹیکنالوجی، روڈ ٹرانسپورٹ وغیرہ۔ گلوبل بزنس الائنس میں دوسری قسم کا کاروبار، خاص کر کے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیوں کی ایسوسی ایشنز ہیں مثلاً آئی سی سی، بی آئی اے سی (BIAC: the Voice of OECD Business) اور او آئی ای (International Organization of Employers)۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ ادارے عالمی کارپوریٹ شعبے کے مفادات کے تحفظ کے لیے مخصوص ہیں۔

BIAC (بی آئی اے سی) ایک عالمی کاروباری ادارہ ہے جو کہ OECD (او ای سی ڈی)[11] ممبر ممالک کو عالمگیریت پر ماہرانہ رائے فراہم کرتا ہے۔ بی آئی اے سی کو او ای سی ڈی کی کاروباری کمیونٹی کی سرکاری نمائندگی حاصل ہے۔ اس کے اہم مقاصد میں سے ایک ہے کہ کارپوریٹ شعبے کی ضروریات او ای سی ڈی کی پالیسی سازی میں شامل ہوں تا کہ وہ قومی سطح پر قانون کا حصہ بنیں۔

او آئی ای نجی شعبے کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہے۔ اس کے ممبران 143 ممالک میں 150 مالکان کی فیڈریشنز اور دیگر کاروبار پر مبنی ہیں۔ او آئی ای (یعنی مالکین کی عالمی تنظیم) اقوام متحدہ، جی 20 اور دیگر عوامل میں مزدور اور معاشرتی پالیسی پر بحث و مباحثے میں کارپوریٹ شعبے کی نمائندگی کرتی ہے۔ او آئی ای کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کاروبار کے حوالے سے ایسے ضوابط پیش کرے جو کاروبار، نجی شعبے کی ترقی اور پائیدار روزگار میں مددگار ثابت ہو۔[12]

گلوبل بزنس الائنس میں تیسرا گروپ ایسے اداروں کا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ پر براہ راست کام کررہے ہیں۔ ان میں بزنس فائٹس پاورٹی (Business Fights Poverty) سائپ (Centre for International Private Enterprise/CIPE) شامل ہیں۔ CIPE (سائپ) کا تعلق امریکی چیمبر آف کامرس سے ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ یہ دنیا بھر میں نجی شعبہ اور منڈی پر اصلاحات کو فروغ دیتے ہوئے جمہوریت کو مضبوط کرے۔[13] اس کے کلیدی پروگرام میں کارپوریٹ گورننس، ملکیتی حقوق، خواتین اور نوجوان شامل ہیں۔ پاکستان میں سائپ نے ینگ لیڈرز کانفرنس (نوجوان رہنماؤں پر کانفرنس)، ویلیو چین کے مسائل اور خاندانی ملکیت پر مبنی کاروبار (Family Owned Businesses) پر ورکشاپ کروائیں ہیں۔[14]

اوپر بیان کیے گئے گلوبل بزنس الائنس میں یقیناً دنیا کی وہ امیر ترین بین الاقوامی کمپنیاں ہیں جو کہ پہلی اور تیسری دنیا کے مزدوروں کے استحصال اور آج ماحولیاتی و توانائی کے بحران کی ذمہ دار ہیں۔ یہ کمپنیاں اور ان کے معاون ادارے عالمگیریت کے فروغ میں پیش پیش ہیں۔ یعنی پاکستان جیسے کمزور ممالک میں بیکاری کے نفاذ، روزگار اور اجرت میں بے تحاشہ کمی اور ضرورت زندگی کی تمام مصنوعات اور خدمات کی قیمتوں میں دن دوگنی رات چوگنی اضافہ اور ماحولیاتی آلودگی سے لاکھوں مزدوروں کا تکلیف دہ امراض میں مبتلا ہونا اور اموات انہی سرمایہ دار کمپنیوں کے مرحون منت ہے۔ انہی کمپنیوں کے منافع کی حوص، گلوبل وارمنگ کی شکل میں کروڑوں انسانوں اور حیاتیاتی تنوع کی تباہی کا باعث ہے۔ افسوس ہے کہ یہی منافع خور کمپنیاں اب پائیدار ترقی کے اہداف کی تشکیل کے عمل میں اپنے آپ کو مضبوط کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

اگر زراعت کے حوالے سے دیکھیں تو گلوبل بزنس الائنس کا رجحان کارپوریٹ شعبے کے فوائد کو ترجیح دیتا ہوا واضح نظر آتا ہے۔ مثلاً گلوبل الائنس میں موجود کیمیائی کھاد (فرٹیلائزر) کی انڈسٹری تحفظ خوراک حاصل کرنے میں کیمیائی کھاد کی اہمیت کو اجاگر کررہی ہے۔ تحفظ خوراک پر پالیسی سازی میں کچھ نکات کو اہمیت دی گئی ہے مثلاً زرعی سرکاری اخراجات کو بڑھانے اور افریقہ میں ٹیکنالوجی کا فروغ۔ اقوام متحدہ کے تحت زیرو ہنگر (یعنی بھوک کا مکمل خاتمہ) چیلنج نامی

پروگرام کو فوقیت دی جارہی ہے۔15 زیرو ہنگر چیلنج کے مطابق بھوک کا خاتمہ مناسب مقدار میں غذا تک 100 فیصد رسائی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جب اقوام متحدہ خوراک کی رسائی کو فروغ دیتا ہے تو دراصل بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کو خوراک اگانے اور اس کی ترسیل کا حق فراہم کرتا ہے۔ کارپوریٹ زراعت کیمیائی مصنوعات کو استعمال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پیداوار کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنوعی بیجوں کی بنیاد پر پیداوار کی جاتی ہے۔ ایسے زرعی مداخل کے استعمال سے اس شعبے کے منافع میں کئی گنا اضافہ تو ہوتا ہے لیکن اس طریقہ زراعت سے نہ صرف موسمی بحران میں شدت پیدا ہوتی ہے بلکہ چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے لیے محتاجی، مفلسی اور بے روزگاری جیسے سنگین مسائل میں بھی شدید اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا میں عوامی گروہ ''خوراک تک رسائی'' کے حوالے سے پالیسی سازی کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ رسائی کا مطلب ہے کہ خوراک کی کمی کی شکار آبادیوں کو خوراک فراہم کی جائے۔ یہاں تیسری دنیا کی عوام کو صرف صارف بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسی خطے میں زراعت سب سے بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اور یہ چھوٹے اور بے زمین کسانوں، ماہی گیر اور دیگر زرعی پیداواری شعبہ سے تعلق رکھنے والے کروڑوں مزدوروں و کسانوں کے لیے روزگار فراہم کرتی ہے۔ ہمارا خطہ صارفین پر مبنی نہیں بلکہ پیداواری طبقہ پر مبنی ہے۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ تیسری دنیا میں بھوک کا خاتمہ صرف اور صرف چھوٹے اور بے زمین کسانوں اور دیگر چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والے گروہوں کا خوراک کے حوالے سے تمام پیداواری وسائل پر مکمل اختیار کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

لوئی کانترو، آئی سی سی کی مستقل بنیادوں پر رہنما نے گلوبل بزنس الائنس فار پوسٹ 2015 اور بزنس اور انڈسٹری میجر گروپ کی طرف سے اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں سے مختلف موقعوں پر خطاب کرتے ہوئے سرمایہ داری اور زراعت کے حوالے سے کئی نکات پیش کیے۔ کاروباری شعبہ کے مطابق پائیدار ترقی کے لیے عالمی تجارتی نظام کی تشکیل کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ڈبلیو ٹی او تجارت کی ترقی میں بہتر اثر کرنے والا سب سے موثر آلہ ہے۔ اس کے علاوہ کمپنیاں نئی ابھرتی ہوئی منڈیوں میں تربیت، تعلیم اور ترسیل و تقسیم کے نظام کے ذریعہ ہمہ گیر مثبت اثر کررہی ہیں۔16 بزنس میجر گروپ کے مطابق زراعت بڑے پیمانے پر ایک ''علم'' استعمال کرنے والا شعبہ (knowledge-intensive sector) ہے اور اس لیے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ تربیت اور ایکسٹینشن کی سہولیات تک رسائی کی ضرورت ہے۔ ایکسٹینشن کے ذریعے کسان ٹیکنالوجی کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور بہتر بیج، کیمیائی کھاد وغیرہ استعمال کرسکتے ہیں۔ جس کے تحت وافر اور غذائیت سے بھرپور غذائی پیداوار کی جاسکتی ہے۔ دیگر یہ کہ ایکسٹینشن کی خدمات کھیت کی دیکھ بھال اور مارکیٹنگ کے حوالے سے ان کی صلاحیت بڑھانے میں کام آتی ہیں۔ زراعت کو متحرک شعبے میں تبدیل کرنے کے لیے پالیسی سازی اور ڈھانچہ (انفراسٹرکچر) کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ عورت ایکسٹینشن ایجنٹس (کارکنان) کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ گھریلو سطح پر فلاح و بہبود اور غذائیت میں بہتری لائی جاسکے۔17

اس کے علاوہ بزنس اینڈ انڈسٹری میجر گروپ کے بیان میں ویلو چین (value chain) اور چھوٹے پیمانے پر کاروبار (Small and Medium Enterprises/SMEs) کرنے والے اداروں کا خاص ذکر ہے۔ خیال ہے کہ یہ ادارے مصنوعات کی قدر بڑھانے کے نظام (ویلو چین) میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عورت انٹرپرنیور شپ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ معاشی بڑھوتری میں کاروبار کرنے والی عورتیں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن نظر انداز کی گئی ہیں۔18

ان بیانات سے کچھ اہم ترین نکات سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک، زراعت علم استعمال کرنے والا شعبہ سے دراصل مراد یہ ہے کہ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں نے جو ''نئی ایجادات'' کے تحت نئی مصنوعات اور خدمات بنائیں ہیں ان کو کسانوں کی ''تربیت'' کے ذریعہ کسانوں کو ان ٹیکنالوجیوں سے روشناس کرایا جارہا ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ بین الاقوامی کاروباری شعبہ اپنی نئی ایجادات اور ٹیکنالوجیوں کے لیے ہمارے ملکوں کی زرعی منڈی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے راہ استوار کررہا ہے۔ جیسے کہ سبز انقلاب کے لیے تیسری دنیا کے زراعت کے سرکاری اداروں نے بڑے پیمانے پر ایکسٹینشن کے محکموں کی تشکیل دے کر ہائبرڈ اور دیگر زیادہ پیداواری بیج، کیمیائی کھاد اور زہریلی دواؤں کو زبردستی زراعت کا حصہ بنایا تھا۔ اب کمپنیوں کے نئی ہائبرڈ اور جینیاتی بیجوں کے استعمال کے لیے دوبارہ سے ایکسٹینشن محکموں کی خدمات کے حصول کی طرف پیش قدمی صاف نظر آرہی ہے۔ کسانوں کو مارکیٹنگ کے حوالے سے تربیت بھی ایک خاص مقصد سے دی جارہی ہے۔ جیسا کہ بزنس انڈسٹری اور میجر گروپ کے بیان سے واضح ہے کہ کمپنیاں اب کسانوں کو زرعی پیداواری عمل میں ترسیل و تقسیم کے نظام یعنی سپلائی چین اور ویلو چین کا حصہ سمجھتیں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کسان کمپنیوں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ان کی پیداواری اشیاء استعمال کرتے ہوئے ایسی زرعی مصنوعات کی پیداوار کریں جو کہ کمپنیاں ان سے حاصل کرکے دنیا کی منڈیوں میں فروخت کریں۔ اس پوری پیداواری زنجیر یا ویلو چین میں کسان اب ایک مزدور اور کمپنیوں کے منافع بڑھانے کے لیے ایک اہم آلہ بن کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح انٹرپرنیور عورت یعنی نئے کاروبار کو شروع کرنے والی عورتوں کو بھی ویلو چین کا حصہ بنایا جارہا ہے، تاکہ وہ سستے داموں اعلیٰ معیار کی مصنوعات اپنے علاقے کی مزدور عورتوں کا استحصال کرکے بنوائیں اور کمپنیوں کو فراہم کرکے ان کے کمپنیوں کے منافع میں مزید اضافہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ''عورتوں کے

حقوق'' کا خیال کیا جارہا ہے تاکہ گھر کی چار دیواری میں بند عورتوں تک رسائی بھی ممکن ہوجائے۔ عورتوں کو پدرشاہی نظام سے ''آزاد کرانے کا طریقہ'' کاروبار کی نظر میں ان کو نئی ٹیکنالوجی سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ بھی سستے مزدور کی حیثیت سے پیداواری عمل میں حصہ لے سکیں! یعنی ان کو ویلو چین میں جوڑ کر ان سے زیادہ سے زیادہ پیداوار لے کر، ان کو کیمیائی کھاد اور دیگر ٹیکنالوجیاں مہنگے مہنگے داموں فروخت کرکے انہیں مزید قرض اور افلاس کے دلدل میں دھکیل دیا جائے۔

انسانیت کو درپیش بحرانوں کی کثرت اور سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہیے تھا کہ پائیدار ترقی کے اہداف کی تشکیل کے لیے ہمہ جہتی مذاکرت میں مرکزی اہمیت اس بات کو حاصل ہوتی کہ بڑھتی ہوئی المناک حد تک عدم مساوات اور نازک ماحولیاتی توازن میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لیے فوری اور تیز رفتار اقدامات کیے جاتے مگر اس کے برخلاف عالمگیریت کے ایجنڈے کا نفاذ جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوسٹ 2015 کے مذاکرات کو اب ''ترقی کے ایجنڈا کی نجکاری'' سمجھا جاتا ہے۔

پائیدار ترقی اور سرمایہ دار ممالک

اب تک ہم نے کمپنیوں کے مقاصد پر نظر دوڑائی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان حکومتوں اور ان کی پالیسی سازی کا بھی جائزہ لیا جائے جہاں سے دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کا تعلق ہے۔ نجی شعبہ کو ترقیاتی ایجنڈا میں فروغ دینے کا عمل گلوبلائزیشن کا ایک اہم جز ہے۔ او ای سی ڈی اور ورلڈ بینک نے اس حوالے سے تفصیلی پالیسی سازی کی ہے۔ دونوں اداروں کا زور ہے کہ نجی شعبہ کو سرمایہ کاری کرنے کے لیے ایک کارآمد اور مہمان نواز ماحول کی ضرورت ہے۔[19] جس سے مراد:

- حکمرانی کا ایسا نظام واضع کیا جائے جو کہ کاروباری اداروں کو بغیر سرکاری رکاوٹوں اور روک ٹوک کے کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے علاوہ قابل اعتماد کاروباری قوانین، نجی ملکیت کا تحفظ اور تنازعہ کی صورت میں مسائل حل کرنے کے لیے طریقہ کار کی یقین دہانی کرے۔
- بہتر انفراسٹرکچر، سامان کی نقل وحرکت، معلومات کے حصول کے لیے خدمات اور انٹرپرینیورشپ کی خدمات میسر ہوں تاکہ کاروباری ادارے اپنا کام بہتر طور پر کرسکیں۔
- قوانین اور نظم و ضبط کے نظام میں اصلاح اور مقابلہ سازی کی فضاء قائم کی جائے اور کاروباری طرز حکمرانی (corporate governance) کو فروغ دیا جائے تاکہ نجی کاروبار عوامی بہتری کے لیے استعمال کیا جاسکے۔
- مقابلہ سازی کے ماحول میں منڈی کی معیشت کے لیے قانونی اداروں کو فروغ دیا جائے جہاں زیادہ توجہ تجارتی قوانین اور بین الاقوامی منڈیوں تک رسائی پر ہو۔
- ہنر مند اور تعلیم یافتہ شعبہ (ہیومن ریسورس) اور مزدوروں کی منڈی (لیبر مارکیٹ) کو فروغ دیا جائے۔
- مالی شعبہ کو فروغ دیا جائے۔
- ایسی سرکاری پالیسیاں اور اقدامات کو فروغ دیا جائے جن کے ذریعے ایک مستحکم کلاں معاشی ماحول قائم ہوسکے۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک نا صرف نجی شعبہ کو ترقی کا محور قرار دے رہے ہیں بلکہ ان کے خیال سے غربت کے خاتمہ کے لیے بھی کاروباری شعبہ کا ایک کلیدی کردار ہے۔ اس طریقہ کار کی تقلید تمام سرمایہ دار حکومتوں کے اہم پالیسی دستاویز میں صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً فورتھ ہائی لیول فورم فار ایڈ جو دسمبر 2011 میں جنوبی کوریہ میں منعقد ہوا، کے اختتام پر دستاویز ''بوسان پارٹنرشپ فار افیکٹیو ڈیولپمنٹ (Busan Partnership for Effective Development) نجی کاروبار کا نئی ایجادات، دولت پیدا کرنے اور غربت میں کمی لانے کے عوامل میں کلیدی کردار کا اعتراف کرتا ہے۔[20]

ایک اہم دستاویز ''غریب پرور نشو ونما'' (Pro-Poor Growth) او ای سی ڈی کی جانب سے 2006 میں پیش کیا گیا۔ اس کے مطابق نجی شعبہ اقتصادی ترقی میں ایک اہم حصہ دار اور روزگار مہیا کرنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔[21]

نجکاری پالیسی سازی کے نتیجہ میں نجی شعبے کے کردار کو تمام ترقیاتی منصوبوں کے عمل درآمد میں ایک مرکزی حیثیت عطا کر دی گئی ہے چاہے وہ توانائی، زراعت، صحت، تعلیم، نقل وحمل یا کسی اور شعبے سے متعلق ہوں۔ نجی کاروبار کے عمل کاری کے لیے نجی سرکاری اشتراک (Private Public Partnership/PPP) وہ نمونہ ہے جیسے ہر طرح کے نام نہاد ترقیاتی منصوبوں، پروجیکٹ اور اسکیموں کے نفاذ کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

بنیادی طور پر PPP (پی پی پی) کا مطلب ہے کہ نجی شعبہ تمام تر مصنوعات اور خدمات عوام کو فروحت کرے گا جس مقصد کے لیے سرکاری انفراسٹرکچر اور دیگر سرکاری سہولیات استعمال ہوں گی۔ ان خدمات کی قیمت طے کرنے کا فیصلہ نجی شعبے کے اختیار میں ہوگا۔ پی پی پی کاروباری شعبہ کی منافع کی شرح بڑھانے میں نہایت کارآمد ہے کیونکہ سرکاری انفراسٹرکچر اور دیگر خدمات کے استعمال سے کاروباری شعبہ کئی اقسام کے اخراجات سے بچ جاتا ہے۔ یوں ایک طرف کاروباری شعبہ پھیلتا جارہا ہے اور دوسری طرف سرکار کا عوام کی بھلائی میں کردار کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔

موسمی بحران سے نمٹنے اور پائیدار ترقی کے حصول کے لیے ایک اور اصطلاح، سبز معیشت کو متعارف کیا گیا ہے جسے دیہی اور شہری ترقی کے لیے اہم ترین قرار دیا جارہا ہے۔[22] سبز معیشت نے کئی طرح کے نئی ٹیکنالوجیاں متعارف

کروائی ہیں جو کہ قابل تجدید توانائی کے ذرائع پر مبنی ہیں۔ جس کا مقصد ہے کہ صنعتی پیداواری نظام میں ماحول دشمن رکازی ایندھن کے استعمال میں کافی حد تک کمی کی جاسکے۔ اس کے علاوہ زرعی شعبے میں ماحولیاتی بحران سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پر مبنی جینیاتی بیج، حیاتی گیس، ایروپونکس، ہائیڈروپونکس جو کہ خوراک کی پیداوار کے لیے استعمال ہوتے ہیں، سب کی بنیاد سبز معیشت پر ہے۔ سبز توانائی جو کہ قابل تجدید توانائی مثلاً پن چکی، شمسی پینل اور زرعی ایندھن استعمال کرتی ہے سبز معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ٹیکنالوجیاں بذات خود مکمل طور پر رکازی ایندھن سے بے نیاز نہیں ہیں۔ مگر اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ بہت وسیع پیمانے پر قدرتی وسائل کا استعمال کرتی ہیں اور یقیناً ان کا بڑے پیمانے پر استحصال کریں گی جس کی وجہ سے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ پوری دنیا کے ماحولیاتی نظام میں مزید بگاڑ پیدا ہوگا۔

سبز معیشت کے ذریعہ متعارف کی جانے والی تقریباً تمام ٹیکنالوجی کو ذہنی ملکیت کے تحت تحفظ حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ٹیکنالوجیاں سرمایہ دار ممالک کی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔ سبز معیشت سے جڑی تمام تر مصنوعات اب غریب ممالک میں بیچی جائیں گی۔ ایک طرف ان کی منافع بخش قیمت رکھی جائے گی اور دوسری طرف ان پر بھاری رائلٹی کی مد میں مزید نفع کمایا جائے گا۔ سرمایہ دار حکومتیں دراصل سبز معیشت کا پرچار اسی لیے کررہی ہیں کہ ان کے خطہ میں موجود شدید معاشی بحران سے نکلنے کا خاطر خواہ راستہ ڈھونڈا جاسکے۔ دنیا کی بڑی کمپنیوں کا تعلق او ای سی ڈی کے حکومتوں سے ہے۔ اسی لیے امریکہ، جرمنی، فرانس، برطانیہ اور دیگر ممالک نجکاری اور آزاد تجارت کی پالیسیاں تیسری دنیا کے ممالک پر مسلط کروا کر سبز معیشت پر مبنی شعبہ کے لیے کئی طرح کی ٹیکنالوجیوں کے لیے منڈی قائم کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''پائیدار ترقی کے حصول'' کے لیے نجی شعبہ کو پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے ذریعہ ملکوں میں قدم جمانے کا انتظام کیا جارہا ہے۔

پائیدار ترقی اور تیسری دنیا کی حکومتیں

کہا جاسکتا ہے کہ تیسری دنیا کی حکومتوں استعماری پالیسوں کا مقابلہ کرنے میں جن کی وجہ سے ایک دنیا کی اکثریت قرضے، بھوک اور غربت کا شکار ہے، ناکام رہی ہیں۔ جی 77 ممالک اور چین ''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' دستاویز کو اپنے مذاکرات کی بنیاد کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ دستاویز انسانی حقوق بشمول عورتوں کے حقوق اور خوراک کا حق تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ ڈبلیو ٹی او میں شامل ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کو بھی کلیدی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ٹیکنالوجی ٹرانسفر جس کا ذکر بزنس اور انڈسٹری میجر گروپ بارہا کررہا ہے کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوگا۔ سبز معیشت کے تحت نئی ایجادات کے علاوہ جینیاتی اور ہائبرڈ بیجیں سب تیسری دنیا کے غریب ممالک کو بھاری منافع کے ساتھ فروخت کی جائیں گی۔ اسی مد میں سرمایہ دار ممالک اپنے ماہرین کو تیسری دنیا میں تربیت دینے کے لیے استعمال کریں گے۔ یعنی ایک اور منافع بخش سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

مذاکرات کے عمل میں ایک اور شعبہ بھی ہے جس میں تیسری دنیا کی حکومتیں ناکامی کا سامنا کررہی ہیں۔ ریو اصولوں (Rio Principles) کے تحت اصول 7 "common but differentiated responsibilities/CBDR" کہلاتا ہے۔ CBDR (سی بی ڈی آر) سے مراد ہے کہ کرہ ارض کے تیزی سے بگڑتے ہوئے ماحولیاتی توازن کو سنبھالنے کی ذمہ داری گو کہ امیر سرمایہ دار اور غریب ممالک دونوں پر ہے لیکن تاریخی حوالے سے زیادہ ذمہ داری پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک پر عائد ہوتی ہے۔ کاربن گیسیز کے وسیع پیمانے پر اخراج کی وجہ سے زمین کا درجہ حرارت بڑھنا (گلوبل وارمنگ) ترقی یافتہ ممالک کے صنعتی طریقہ پیداوار کا نتیجہ ہے جو آج موسمی بحران کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ اسی لیے اس میں شک نہیں کہ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری سب پر عائد ہوتی ہے مگر یہ بنیادی طور پر صنعتی سرمایہ دار ممالک کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح اہداف اور اوقات کار کا تعین کریں، نہ صرف کاربن گیسیز کے اخراج کم کرنے میں بلکہ ایسی ترقی پسند پالیسیوں کی تشکیل میں جو کہ منصفانہ پائیدار ترقی کو یقینی بنائیں۔ اس حوالے سے بھی پہلی دنیا کے امیر ممالک نے کسی مخصوص تجاویز کی نشاندہی نہیں کی 23 جس کے تحت یہ کہا جاسکے کہ یہ ممالک ماحولیات کی تباہ کاری سے ہونے والے نقصانات کے ازالہ کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

پائیدار ترقی کے اہداف کی نشاندہی کے عمل میں ایک اہم مسئلہ اس کے نفاذ کے وسائل (means of implementation/MOI) کا بھی ہے۔ MOI (ایم او آئی) وہ بنیادی وسائل ہیں جو پائیدار ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے درکار ہیں۔ اس میں ایک دوسرے پر منحصر وسائل و شعبہ جات شامل ہیں جیسے کہ مالیاتی وسائل، ٹیکنالوجی کا تبادلہ، استعداد میں اضافہ اور قومی ماحول جس کی بنیاد پر نئے پائیدار ترقی کے ڈھانچے کا نفاذ ممکن ہوگا۔ مثلاً اگر پائیدار روزگار یا پھر بیروزگاری کا مکمل خاتمہ پائیدار ترقی کا ایک ہدف ہے تو اس کے لیے حسب ضرورت مالیاتی وسائل، مناسب ٹیکنالوجی، تیکنیکی مدد اور صلاحیت بڑھانے کے لیے تربیتی پروگراموں کی ضرورت ہوگی تاکہ قومی سطح پر ایسی پالیسیاں نافذ کی جاسکیں جو کہ روزگار کو کلیدی اہمیت دیتی ہوں۔24 لیکن افسوس ہے کہ پائیدار ترقی کے اہداف کے لیے ایم او آئی پر پہلی دنیا کے ممالک کی طرف سے کوئی خاطر خواہ پیش رفت نظر نہیں آرہی ہے۔25

عوام کا مقام

ہماری حکومتوں کا کمزور مقام واضح ہے۔ پائیدار ترقی کے اہداف کے لیے ہونے والے مذاکرات اگلے 15 سال یعنی 2030 تک کے لیے ترقیاتی ڈھانچہ تشکیل دیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی عالمگیریت کا دور جو کہ نیولبرل پالیسیوں کی جان لیوا پالیسیوں کا نفاذ یقینی بناتا ہے کا آغاز 1980 کی دہائی میں ہوا اور اس نے زمین اور اس کے باسیوں کو شدید بحرانوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

پہلی دنیا کی طرف سے آزاد تجارت اور نجکاری پر دیا جانے والا زور صاف ضاہر ہے۔ سامراجی ممالک کی طرف سے نجکاری کی حمایت کا ہماری حکومتوں، جو کہ دنیا کی دو تہائی عوام کی نمائندگی کر رہی ہیں کا جواب اب تک نہایت افسوس ناک ہے۔ ہمارے ممالک کی اشرافیہ خاص کر کے قومی سطح پر کاروباری شعبہ عوام کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے بین الاقوامی کاروباری اداروں سے گٹھ جوڑ مضبوط کرتے ہوئے سبز معیشت کی ٹیکنالوجیوں کا بھرپور پرچار کر رہی ہے۔[26] اب یہ عوام کی ذمہ داری ہے کہ ان عوام دشمن پالیسیوں کی مکمل روک تھام کے لیے موثر اقدامات اٹھائیں۔

پوسٹ 2015 مذاکرات میں عوامی گروہوں کی شمولیت ایک بے انتہا ضروری عمل ہے۔ گو کہ اقوام متحدہ ایک ایسا مرکز ہے جو کھلے عام سامراجی پالیسیوں کو کندھا دیتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ پلیٹ فارم عوامی گروہوں کا اپنی سرکار سے اپنے حقوق کے لیے مطالبہ کرنے اور ان پر عمل کروانے کے لیے ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ سے جڑے ہوئے نو میجر گروپس میں کئی عوامی گروہ شامل ہیں جن میں خصوصاً عورتوں اور مزدوروں کی رہنمائی کا گروپ کافی حد تک عوام دوست نظریوں کو فروغ دینے میں کوشاں رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دیگر گروپس ہیں خاص کر کے سائنس اور ٹیکنالوجی اور مقامی حکومتیں ایک حد تک اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ کسانوں کا گروپ نہایت کمزور ہے اور اس میں بڑے کسان، خصوصاً کارپوریٹ زراعت سے جڑے کسان زیادہ متحرک نظر آتے ہیں۔

پائیدار ترقی کا حصول ایک بین الاقوامی سرکاری عمل ہے اور اس کا ہر اجلاس امریکہ کے شہر نیویارک میں اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر میں منعقد کیا جاتا ہے۔ یقیناً دنیا کی زیادہ تر عوام نیویارک نہیں جا سکتی اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اصل فیصلہ سازی اور اس پر عمل کاری ہر سرکار اپنے ملک میں ہی کرے گی۔ اس لیے باشعور عوام کی یہ ایک کلیدی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سرکار کو عوام دوست، مزدور کسان دوست اہداف کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر لازمی عمل کروائے۔

اس حوالے سے پہلا قدم تو یہ ہے کہ عوام اپنے اندر موجود مختلف گروہوں کی نشاندہی کرے۔ طبقاتی نظام کے تحت اشرافیہ نے ہر گروہ میں چاہے وہ پڑھا لکھا طبقہ ہو، پروفیشنل طبقہ ہو یا پھر عوامی گروہ، سب میں ایسے خیالات مسلط کیے ہیں کہ عوام اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے عوام دوست فیصلہ سازی سے ہٹ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کسان کو بین الاقوامی کمپنیاں اور سرکار دونوں سمجھا رہے ہیں کہ جینیاتی بیج اور دیگر لیبارٹریوں میں تیار شدہ کمپنیوں کی ملکیت رکھنے والی بیج سے زیادہ پیداوار حاصل ہوگی۔ لیکن یہ سب کو پتہ ہے کہ یہ بیج زہریلی کھاد اور کیڑے مار مواد کے بغیر پنپ نہیں سکتی۔ جتنی پیداوار ہوتی ہے اس سے زیادہ مالیت زرعی مداخل خریدنے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ کسان زیادہ پیداوار کے جھانسے میں آ کر اپنی زمین کو تباہ کرتے ہوئے نئے نئے محتاج کرنے والی بیجوں کو ہر سال منڈی سے لا کر استعمال کرتا ہے۔

زرعی اور دیگر درس گاہوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کردہ طبقہ ان کمپنیوں میں افسر کی حیثیت حاصل کرتے ہوئے اس سرمایہ داری علم کو نہیں جانچتا جو ایک اکثریت کو بھوک اور قرض کے دلدل میں پھنسا رہا ہے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں اگر ہزاروں نہیں تو کئی سو ایسے بھی عوام دوست سائنس دان ہیں جنہوں نے ان بین الاقوامی کمپنیوں کے کالے منصوبوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس پڑھے لکھے طبقہ نے مزدور و کسان کے بنائے ہوئے ترقی کے منصوبے کو اپنایا ہے جس کو عوام نے سرمایہ دار، جاگیردار کے لیے نہیں بلکہ اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے وضع کیا ہے۔ مزدور و کسان جانتا ہے کہ پائیدار ترقی یقیناً تمام پیداواری وسائل چاہے وہ زرعی پیداوار کا حصہ ہوں یا صنعتی پیداوار کا، مزدور کے اختیار میں ہونے چاہئیں۔ اس طرح کے لائحہ عمل کو لاگو کرنے کے لیے تمام فیصلہ سازی بھی دیہی اور شہری مزدوروں کے اختیار میں ہونا لازم ہے۔ یقیناً انہی حالات میں پائیدار ترقی کا حصول ممکن ہے ورنہ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقات گٹھ جوڑ کرتے ہوئے عوام کے استحصال کا سلسلہ یقیناً جاری رکھیں گے۔

اگر غور کیا جائے تو عوام کئی گروہوں کا حصہ ہے۔ اس میں استاد، وکلاء، ڈاکٹرز، انجینئرز، نرسز اور دیگر کئی پروفیشنل گروہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ، نوجوان، عورتیں ہیں، ان کا معاشرے میں کلیدی کردار ہے۔ سب سے اہم یقیناً مزدور طبقہ ہے جو کہ شہری مزدور بستیوں اور دیہی آبادیوں پر مشتمل ہے اور یقیناً سب سے زیادہ معاشی اور ماحولیاتی بحرانوں کا شکار ہے۔ مزدور طبقہ بذات خود کئی گروہوں پر مشتمل ہے مثلاً کسان، شہری اور زرعی مزدور، ماہی گیر، چرواہے وغیرہ۔ پائیدار ترقی کے اہداف دراصل ان گروہوں کے لیے نہایت اہم ہیں۔

ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ہر طبقے کے پاس عوام دوست ترقی کا لائحہ عمل لے کر جائیں۔ ہوشمند باشعور عوام کی اس وقت سب سے اہم ذمہ داری ہے کہ ہر گروہ کو مشاورتی عمل میں شامل کریں اور ان اہداف کی نشاندہی کریں کہ جو آنے والے 15 سالوں میں عوام کی خودمختاری کے لیے اشد ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

تیسری دنیا کے غریب ممالک میں عوامی گروہوں کے درمیان اب تک

ہونے والے مشاوراتی عمل میں ترقیاتی انصاف کو پائیدار ترقی کا محور بنایا ہے۔ ترقیاتی انصاف عدم مساوات اور عدم انصاف کی مکمل نفی کرتا ہے۔ مساوات تین سطحوں پر لاگو کرنے کی نشاندہی کی گئی ہے: 1۔ امیر اور غریب ممالک کے درمیان مساوات۔ 2۔ ملکوں کے اندر امیر اور غریب کے درمیان مساوات۔ 3۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات۔ ان تینوں دائرہ کار میں مساوات مندرجہ ذیل ترقیاتی اہداف کے حصول کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ان اہداف میں شامل ہیں۔ 1۔ انسانی حقوق۔ 2۔ دولت اور دیگر وسائل کی منصفانہ تقسیم جس میں زرعی زمین کی تقسیم اہم ترین ہے۔ 3۔ خوراک کی خودمختاری۔ 4۔ آسودہ روزگار پر مبنی کل روزگار۔ 5۔ حقوق نسواں۔ 6۔ تعلیم اور صحت کی سہولتوں تک مکمل رسائی۔ 7۔ سماجی تحفظ۔ 8۔ موسمی انصاف۔ 9۔ تجارتی اور مالیاتی اداروں کے لیے نئے ڈھانچوں کی تشکیل۔

یقیناً یہ عمل اس جدوجہد کا ایک حصہ ہے جو کہ تمام عوامی گروہوں کو منظّم کرتے ہوئے بالآخر ایک عوام دوست، ماحول دوست معاشرے کا حصول یقینی بنائے۔ وسائل اور فیصلہ سازی پر اختیار کی جدوجہد آسان نہیں لیکن کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ بربادی کے جس دھانے پر آج مزدور و کسان کھڑے ہیں اس سے نجات صرف اور صرف عملی جدوجہد کے ذریعہ ہی ممکن ہے!

حوالہ جات

1. Rana, Shahbaz. "Poverty alleviation: ADB post progress on development goals." The Express Tribune, September 21, 2013.
2. Pingeot, Lou. "Corporate influence in the Post-2015 process." Misereor, Bread for the World & Global Policy Forum, January 2014, p. 7. Accessed from https://www.globalpolicy.org/images/pdfs/GPFEurope/Corporate_influence_in_the_Post-2015_process_web.pdf
3. Beyond 2015. "Committee of Experts on Sustainable Development Financing." Beyond 2015. Accessed from http://www.beyond2015.org/committee-experts-sustainable-development-financing
4. Pingeot, Lou. "Corporate influence in the Post-2015 process."
5. World Economic Forum. "Our members." Accessed from www.weforum.org/our-members
6. World Economic Forum. "Building on the Monterrey Consensus: The growing role of Public - Private Partnerships in mobilizing resources for development." World Economic Forum, 2005.
7. The Blue Planet Project "Action alert: let Ban Ki-moon know you want human rights in the SDGs." July 8, 2014. Accessed from: http://www.blueplanetproject.net/index.php/let-ban-ki-moon-know-you-want-human-rights-in-the-sdgs/
8. Pingeot, Lou. "Corporate influence in the Post-2015 process."
9. ICC: The World Business Organization. "Intellectual Property." Accessed from http://www.iccwbo.org/advocacy-codes-and-rules/areas-of-work/intellectual-property/
10. ICC: The World Business Organization. "Meeting of the Intergovernmental Committee of Experts on Sustainable Development Financing." December 5, 2013. Accessed from http://sustainabledevelopment.un.org/content/documents/5258icc.pdf
11۔ آرگنائزیشن فار ایکنامک کوآپریشن اور ڈیولپمنٹ (Organization for Economic Co-operation and Development/OECD) دنیا کے 34 ممالک ہیں جن میں امریکہ، کینیڈا، جاپان کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک شامل ہیں۔ یہ ادارہ سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا مہور بناتا ہے اور منڈی کے ذریعے بہتر معاشی ترقی کو فروغ دینے کا حامی ہے۔
12. International Organisation of Employers. "Welcome to the International Organisation of Employers." Accessed from http://www.ioe-emp.org
13. CIPE. "Overview and history." Accessed from www.cipe.org/about/overview-history
14. Center for International Private Enterprise, "CIPE Pakistan Office." Accessed from http://www.cipepk.org/
15. Danielou, Morgane. "What is the role of business groups in policy coherence action agendas? What lessons can be learned from public-private sector dialogue in developing countries?" International Fertilizer Industry Association. Presented at Policy Coherence for Development in a Post-2015 Era: How can PCD help advance universal goals and contribute to transformational change? Paris, March 4-5, 2014. Accessed from http://www.oecd.org/pcd/seventh-meeting-of-national-focal-points-for-pcd.htm.
16. International Chamber of Commerce. "Meeting of the Intergovernmental Committee of Experts on Sustainable Development Financing December 5, 2013." Accessed from http://sustainabledevelopment.un.org/content/documents/5258icc.pdf
17. International Chamber of Commerce. "Eleventh Session of the General Assembly Open Working Group on Sustainable Development Goals meeting with Major Groups and other Stakeholders UN Headquarters, CR-1 CB 5 May, 2014." Accessed from http://www.iccwbo.org/Data/Documents/Global-Influence/International-Organizations/UN/Remarks-by-Dr-Louise-Kantrow_-Permanent-Representative-of-the-International-Chamber-of-Commerce-to-the-UN-on-behalf-of-the-Global-Business-Alliance_-5-May-2014/
18. Ibid.
19. IBON International "IBON Primer on the private sector in development: privatization of development cooperation." IBON International, 2014, p. 15.
20. 4th High Level Forum on Aid Effectiveness. "Busan Partnership for Effective Development Co-operation." Fourth High Level Forum on Aid Effectiveness, Busan, Republic of Korea, 29 Novermber - 3 December 2013. Accessed from http://effectivecooperation.org/files/OUTCOME_DOCUMENT_-_FINAL_EN2.pdf
21. Organization for Economic Co-operation/OECD. "Promoting pro-poor growth: private sector development." OECD, 2006. Accessed from http://www.oecd.org/dac/povertyreduction/36427804.pdf
22. United Nations Environment Program. "Towards a Green Economy: pathways to sustainable development and poverty eradication." UNEP, 2011.
23. Third World Network. "SDGs - a few steps forward, a few steps backwards." TWN Info Service on UN Sustainable Development (May 14/06), 20 May 2014. Accessed from http://www.twnside.org.sg/title2/unsd/2014/unsd140506.htm
24. Khor, Martin. "SDGs: Fast employment as a top priority goal." South Centre Paper on Sustainable Goals, in South Centre. "Post 2015. Development Agenda and Sustanable Development Goals: Perspectives of the South Centre." Accessed from http://www.southcentre.int/wp-content/uploads/2013/10/Post-2015-and-SDGs-Perspectives-of-the-South-Centrer1_EN.pdf
25. Statement on behalf of the Group of 77 and China by H.E. Mr Rene Orellana, Ambassador on Environment and Development Issues of the Plurinational State of Bolivia, at the 11th session of the Open Working Group on Sustainable Develoment Goals (SDGs) on "Means of Implementation and Global Partnership for Sustainable Development." New York, 9 May 2014. Accessed from http://www.g77.org/statement/getstatement.php?id=140509b
26. APP. "Green growth new development agenda: Pakistan needs to re-orient its economy on green discourse: Experts." May 18, 2012. Accessed from http://www.app.com.pk/video/preview.php?id=49310

زراعت میں ایف اے او کا کردار

تحریر: ولی حیدر

اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے خوراک و زراعت (Food and Agriculture Organization/FAO) کی 32 ویں ایشیاء پیسفک علاقائی کانفرنس منگولیا کے شہر اولنبتار میں 13-10 مارچ کو منعقد ہوئی۔ FAO (ایف اے او) ہر دو سال بعد ایک علاقائی کانفرنس کا انعقاد کرتا ہے جس میں مختلف ممالک کے زراعت سے منسلک وزراء، نائب وزرا یا سرکاری عہدیداران شرکت کرتے ہیں۔ اس کانفرنس میں مخصوص علاقائی مسائل اور ترجیحی شعبوں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے، جو ایف اے او کے آئندہ کے پروگراموں اور بجٹ کی تیاری میں مددگار ثابت ہو سکے۔ اس کے ساتھ طویل مدتی منصوبوں پر بھی غور کیا جاتا ہے۔

کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے ایف اے او ایشیاء پیسفک کے علاقائی ڈائریکٹر مسٹر کنوما نے کہا کہ ایشیاء پیسفک کا علاقہ پچھلے چند دہائیوں سے شدید مشکلات کا شکار ہے۔ تیز رفتار معاشی ترقی جو کہ زیادہ تر ایشیاء و پیسفک میں ہوئی معاشی ڈھانچہ میں تبدیلی کا باعث بنی پر اس ترقی میں شعبہ زراعت کا حصہ کم دیکھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں زراعت کا جی ڈی پی (Gross Domestic Product/GDP) میں حصہ ایشیاء کے تقریباً تمام ملکوں میں کم رہا۔ جبکہ پہلے جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ زیادہ ہوا کرتا تھا۔

اپنے ابتدائی کلمات میں مسٹر کنوما نے کہا کہ ایف اے او تحفظ خوراک پر مبنی دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔[1] جہاں زراعت تمام لوگوں بالخصوص غریبوں کو ایسی معیاری زندگی فراہم کرے جو کہ معاشی، سماجی اور ماحولیاتی طور پر ہم آہنگ ہو۔ آج دنیا میں خوراک کی پیداوار ہر انسان کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس پیداواری سال (2013-14) میں عالمی طور پر درکار اناج کی ضرورت سے زیادہ پیداوار ہوئی۔ خوراک کی پیداوار میں اضافہ کے باوجود آج دنیا میں تقریباً ایک ارب لوگ غذائی کمی کا شکار ہیں۔ یعنی دنیا کا ہر آٹھواں شخص شدید بھوک کا شکار ہے جبکہ دو ارب سے زیادہ افراد خوراک میں غذائی کمی کا شکار ہیں۔ دوسری طرف تقریباً ڈیڑھ ارب افراد غلط غذا کی وجہ سے بہت زیادہ وزن یا موٹاپے کا شکار ہیں اور نتیجہ میں انہیں زیابطیس یا دل کی بیماری لاحق ہے۔ یہ ایک نا قابل معافی سماجی ناانصافی اور ناہمواری ہے اور یقیناً سنگین انسانی حقوق کا مسئلہ بھی۔ دنیا میں بہت سے انسانی حقوق پر بات ہوتی ہے مگر ہم سب سے اہم اور بنیادی انسانی حق کو بھول بیٹھے ہیں یعنی ''خوراک کا حق''، خوراک جس کے بغیر ہم زندگی سے ہاتھ کھو دیں گے۔ تیز رفتار معاشی ترقی کے باوجود ایشیاء پیسفک 63 فصید شدید بھوک کے شکار لوگوں کی آماجگاہ ہے۔

ملینیم ترقیاتی ہدف نمبر 1 جو کہ غربت کے خاتمہ اور بھوک میں کمی کے حوالے سے ہے، کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر کنوما نے کہا کہ اس ضمن میں ہم نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے لیکن اگر 2015 تک ہم اسے 12 فیصد تک لے بھی آئے تو 12 فیصد انتہائی بھوک کے شکار افراد پھر بھی موجود رہیں گے جو ہمارے معاشرے کا سب سے محروم اور پسماندہ طبقہ ہے۔ جبکہ ہمارا مقصد بھوک کا مکمل خاتمہ ہے۔[2]

ایف اے او اقوام متحدہ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جیسے دنیا بھر کی حکومتیں تسلیم کرتی ہیں اور خوراک و زراعت کے مسائل پر اس ادارے کی رائے اور تجربہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جب ایسے ادارے کا انتہائی ذمہ دار شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ محروم طبقات کے مسائل جن میں چھوٹے اور بے زمین کسان، عورتیں اور دیہی نوجوان شامل ہیں، ان پر خصوصی توجہ دیے بغیر پائیدار ترقی، تحفظ خوراک اور انسانیت پر مبنی معاشی ترقی ناممکن ہے تو ایسی تجاویز کیوں زیر بحث ہیں۔ جن سے پھر وہی مسائل جنم لیتے ہیں جن کا مندرجہ بالا سطروں میں ذکر کیا گیا ہے۔

کانفرنس میں مختلف موضوعات پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا، جن میں سے دو کو مختصر یہاں بیان کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ دونوں ہی اس خطے کے کسانوں کے لیے بہت اہم ہیں:

الف۔ ایشیاء و پیسفک میں خوراک زراعت کی صورتحال اور آئندہ کا لائحہ عمل۔

ب۔ سبز ترقی کے پیرائے میں کسانوں کی خواہشات کا حصول۔

الف۔ ایشیاء و پیسفک میں خوراک زراعت کی صورتحال اور آئندہ کا لائحہ عمل

اس موضوع کے تحت انتہائی تفصیل سے ایشیاء و پیسفک میں خوراک و زراعت کے مسائل کا احاطہ کیا گیا جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

- خوراک اور غذائیت کا تحفظ۔
- عورت اور زراعت۔
- سماجی تحفظ۔
- مال مویشیوں کی پیداواری کامیابیاں، مسائل اور انسانی صحت پر اثرات۔
- خاندانی زراعت (Family Farming) کا مستقبل۔

خوراک اور غذائیت کے حوالے سے بتایا گیا کہ اس کے باوجود کے مجموعی طور پر

غذائی کمی کے شکار بچوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے مگر اب بھی ایشیاء میں دنیا کے غذائی کمی کے شکار دو تہائی بچوں کی تعداد موجود ہے۔ ایشیاء میں نامیاتی اجزاء (micronutrients) اور وزن کی زیادتی پر پیش رفت انتہائی سست ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے ملکوں کا خطیر سرمایہ خرچ ہو رہا ہے۔[3]

غذائی کمی کے شکار دو تہائی بچوں کی تعداد ایشیائی خطے میں ہونے کی سب سے بڑی وجہ اس نظام کی سفاکی ہے کہ جس میں مزدور طبقہ کے مفاد کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور منڈی کے اصول مقدم سمجھے جاتے ہیں۔ آزاد تجارت کے تحت چلنے والی معیشتوں میں بے روزگاری اور مہنگائی معمولی سی بات ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کا شکار کثیر آبادی کا تعلق بھی ایشیائی خطے سے ہے۔ ان کے لیے غذا کا حصول بہت مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ اس خطے میں دیگر ابتری کے ساتھ ساتھ غذائی کمی بھی عروج پر ہے۔

عورتوں کے حوالے سے بتایا گیا کہ مجموعی زرعی افرادی قوت کا 40 سے 50 فیصد عورتوں پر مشتمل ہے مگر انہیں مردوں سے کم پیداواری وسائل اور مواقع حاصل ہیں۔ اسی طرح جنوبی اشیاء کے کچھ ملکوں میں 24-15 سال تک کے لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا اسکول میں داخلہ کم ہے۔ اس سماجی ناہمواری کا خاتمہ ضروری ہے۔[4]

عورتوں کے حوالے سے دنیا بالخصوص ایشیاء میں انتہائی متعصّبانہ رویہ اپنایا جاتا ہے۔ نصف سے زیادہ زرعی سرگرمیاں عورتیں سرانجام دیتی ہیں مگر زرعی حکمت عملی اور پالیسی پر مشاورت میں ان کے وجود کو یکسر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا اور اس ظالم رویے کو ایسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے کوئی عام بات ہو۔ پدر سری نظام پر مبنی اس دنیا میں عورتوں سے کام تو بہت لیا جاتا ہے مگر ان کی حیثیت اور اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے عورتیں نہ صرف زراعت بلکہ دیگر شعبوں میں بھی ماہر ہونے کے باوجود کم تر تصور کی جاتی ہیں۔ پیداواری وسائل پر عورتوں کا اختیار اور تعلیم تک رسائی جیسے اہم ترین معاملات میں عورتوں کو مواقع فراہم نہ کرنا اس شعوری کوشش کا نتیجہ جس کے تحت عورتوں کو معاشرے میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ زرعی شعبوں سے وابستہ عورتوں کا استحصال بدترین ہے۔ خاص طور پر تیسری دنیا میں جہاں جدید صنعتی زراعت کی وجہ سے عورتوں کا بہت سے پیداواری وسائل پر اختیار یکسر ختم ہو گیا ہے۔ جن میں سب سے اہم ترین بیج ہے۔ نہ صرف ایف اے او بلکہ دیگر عالمی اداروں کو عورتوں کے ساتھ استحصال کے خاتمہ کے لیے حکمت عملی تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

سماجی تحفظ (Social Protection) کی فراہمی کے حوالے سے کہا گیا کہ ترقی پزیر ممالک کے لیے سماجی تحفظ کی فراہمی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے مگر یہ مستقل حل نہیں کیونکہ اس کے لیے ایک ہمہ گیر زرعی ترقیاتی منصوبے کی ضرورت ہے۔ سماجی تحفظ کے مختلف پروگراموں سے چھوٹے کسانوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اکثر دیہی علاقوں میں چلائے جاتے ہیں۔[5]

سماجی تحفظ کو عالمی ادارے اور حکومتیں عوام کو فریب دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ایک ایسے نظام میں جہاں تمام پالیسیاں عام لوگوں سے سہولیات دور رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور جس کے نتیجے میں تقریباً ایک ارب کی آبادی شدید بھوک کا شکار اور خوراک جیسی بنیادی انسانی حق سے محروم ہو وہاں سماجی تحفظ کے نام پر گنے چنے لوگوں میں خیرات بانٹنے سے مسائل کا خاتمہ ممکن نہیں۔

> سماجی تحفظ:
>
> سماجی تحفظ غربت سے نمٹنے کے لیے پالیسی سازی ہے اور سماجی انصاف فراہم کرنے کا اصلاحی طریقہ بھی۔ سماجی تحفظ کا لفظ اب عام طور پر ملکی اور عالمی دستاویزات میں نظر آنے لگا ہے۔ سماجی تحفظ کے پروگراموں کے تحت پسماندہ طبقات کو نقد رقم کی فراہمی، اشیاء/مصنوعات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ دیگر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔

ایف اے او کے مطابق مال مویشی کے شعبوں کی تیز رفتار ترقی سے کھاتے پیتے خوشحال لوگوں کے لیے گوشت کی فراہمی بڑھ گئی مگر دوسری طرف بہت سی منفی تبدیلیوں کا بھی باعث بنی جو کہ درج ذیل ہیں:[6]

- انسانی صحت کے خطرات میں اضافہ۔
- ماحولیاتی خرابی۔
- برآمد شدہ زہریلی نسلوں کی وجہ سے مقامی نسلوں کا خاتمہ۔
- زرعی مزدوروں کا استحصال اور چھوٹے پیمانے پر جانور رکھنے والوں کی اہمیت میں کمی۔

مال مویشی شعبہ کے حوالے سے جن منفی اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایف اے او صنعتی مال مویشی کے فروغ اور اس شعبہ میں جینیاتی تحقیق کی روک تھام کے لیے کس طرح فعال کردار ادا کرتا ہے اور چھوٹے پیمانے پر مال مویشی پالنے والوں کا مفاد ماحول کی بہتری، مقامی نسلوں کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کرتا ہے؟ کیونکہ امریکی ادارہ برائے زراعت (United States Department of Agriculture/USDA) اور دیگر بین الاقوامی کمپنیاں جینیاتی مال مویشیوں پر تحقیق اور ان کے فروغ میں مصروف ہیں۔ جو کہ یقیناً اوپر بیان کی گئی منفی تبدیلیوں میں شدت کا باعث بنیں گی۔

خاندانی زراعت یا فیملی فارمنگ کے حوالے سے بتایا گیا کہ خاندانی زراعت، زراعت، جنگلات، ماہی گیری کے فروغ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے موجودہ سال

(2014) کو عالمی سال برائے خاندانی زراعت (IYFF) کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔[7]

خاندانی زراعت کے چار بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- ایسی پالیسیوں کی حمایت جو کہ پائیدار خاندانی زراعت کے لیے مفید ثابت ہو۔
- علم، رابطہ کاری اور عوامی آگہی میں اضافہ۔
- خاندانی زراعت کی ضرورتوں، مواقعوں اور رکاوٹوں کی بہتر سمجھ بوجھ کے ساتھ تیکنیکی سہولتوں کی یقینی فراہمی۔
- پائیداری کے لیے ہم آہنگی پیدا کرنا۔

ایف اے او خاندانی زراعت کے فروغ میں مصروف نظر آ رہا ہے۔ بظاہر یہ بہت اچھا قدم ہے مگر اس سے جڑے مسائل کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایف اے او موجودہ استحصالی نظام کا تسلسل ہی چاہتا ہے نہ کہ چھوٹے کسانوں کو اس جال سے نکالنا۔ خاندانی زراعت زیادہ تر چھوٹے کسان گھرانے کرتے ہیں جس میں بچے بوڑھے غرض کے گھر کا ہر فرد مشقت پر مجبور ہوتا ہے۔ زرعی خاندان دراصل وہ پیداواری اکائی ہے جو کہ بڑے جاگیرداروں اور دیوہیکل زرعی کمپنیوں کے لیے بڑے پیمانے پر پیداوار کر کے دیتا ہے پر خود غربت، بھوک و افلاس میں زندگی بسر کرتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے ساتھ اس طرز کی خاندانی زراعت میں شدید استحصال ہوتا ہے۔ عورتیں تمام محنت طلب کام کرتی ہیں مگر ان کی محنت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ زمین عورت کی ملکیت نہیں ہوتی اس لیے گھر کے مرد اس سے کھیت اور گھر دونوں جگہ کام لیتے ہیں اور بدلے میں اس کو دو وقت کی روٹی بمشکل ملتی ہے۔ یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے کہ موجودہ مشینی طریقہ پیداوار میں چھوٹے کسانوں کے لیے آسودہ روزگار حاصل کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ زراعت میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کردار کو ختم کیے بغیر خاندانی زراعت کا فروغ صرف جاگیرداروں اور شاہی خاندانوں کو ہی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

(ب) سبز ترقی کے پیرائے میں کسانوں کی خواہشات کے حصول

اس موضوع پر ایف اے او کے مسودے میں سبز انقلاب کو جادوئی چھڑی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں بتایا گیا ہے کہ 1960 کی دہائی میں تقریباً ایک ارب بھوک کے شکار افراد کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔[8] دنیا جانتی ہے کہ آج جن اعداد و شمار اور مسائل کا ذکر ایف اے او کی مختلف تحقیقات اور جرائد میں پیش کیے جا رہے ہیں ان کی زیادہ تر وجہ سبز انقلاب ہی ہے۔ یہ سبز انقلاب ہی تھا جس کے تحت مخصوص مصنوعی بیج منڈی میں متعارف کروایا گیا اور اس عمل کے نتیجے میں ہمارا کسان اپنے بیج سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی کے بدولت ہی پیداواری لاگت اس حد تک بڑھ گئی کہ چھوٹا اور بے زمین کسان کاشتکاری کے قابل نہ رہا۔ یہی وہ پس ماندہ طبقہ ہے جو آج روزی کی تلاش میں گاؤں سے شہر کا رخ کرتا ہے اور انتہائی بھوک کا شکار ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس کی وجہ سے عالمی سطح پر ماحولیاتی آلودگی نے تنوع حیات پر کاری ضرب لگایا ہے۔ ان حالات میں ایف اے او کا سبز انقلاب کو طلسماتی انداز میں پیش کرنا ''دال میں کچھ کالا'' کے مترادف ہے۔ ایف اے او کی خوراک و زراعت کے حوالے سے حکمت عملی تضادات کا شکار نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ زراعت کی تباہی کا حال یوں بیان کیا جاتا ہے'' موجودہ دور کی مشینی زرعی پیداوار آج کے مسائل سے نمٹنے کے لیے ناکافی ہے۔ پائیدار ترقی اور قدرتی وسائل کو محفوظ کرنے اور اضافہ کے لیے قدرتی طریقہ پیداوار اور بیرونی مداخل صحیح وقت اور صحیح مقدار میں استعمال کیا جائے۔''[9]

مندرجہ بالا اقتصابات میں تضاد واضح نظر آتا ہے۔ ایک طرف موجودہ طریقہ پیداوار کی نفی کی گئی مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ بیرونی وسائل مثلاً کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات ضرورت کے مطابق ''صحیح وقت'' اور ''صحیح مقدار'' میں استعمال کی جائے۔ یہ کچھ عجب ہی تجویز ہے کیونکہ یہی وہ زرعی مداخل ہیں جو قدرتی طریقہ پیداوار کی مکمل نفی کرتے ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اگر یہ کیمیائی کھاد اور کیڑے مار دوائیاں خاص طور پر مصنوعی بیج مسائل کا حل نہیں تو پھر صحیح وقت پر صحیح مقدار اور صحیح استعمال کی ترغیب تضاد اور ابہام پھیلانا نہیں تو اور کیا ہے؟

ایف اے او کے مستقبل کی چند ترجیحی اقدامات

ایشیاء پیسفک میں ایف اے او 15-2014 کی ترجیحی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایا گیا کہ 2012 میں جن سرگرمیوں کی نشاندہی کی گئی تھی اس پر عمل درآمد ہوا ہے جن میں چاول پر علاقائی حکمت عملی، ناریل پر ترقیاتی تحقیق اور اعلیٰ سطحی مشاورت وغیرہ شامل ہیں۔ 15-2014 کے لیے جن شعبوں پر توجہ مرکوز کی جائے گی وہ درج ذیل ہیں۔

(الف) ایشیا پیسفک میں زیرو ہنگر چیلنج/ بھوک کا مکمل خاتمہ

- تحفظ خوراک کی قومی پالیسی کی تشکیل یا عملدرآمد۔
- غذائی کمی کی پیمائش اور پیمائشی صلاحیت کو بڑھانا۔
- بچوں میں غذائیت اور ذہنی و جسمانی نشو ونما بڑھانا۔[10]

مستقبل کی ترجیحات میں ایشیاء پیسفک میں ''بھوک کے مکمل خاتمہ'' کے لیے جن تین حکمت عملیوں کا ذکر کیا گیا ہے انہیں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ترجیحات بذات خود اچھی پیش رفت ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ''بھوک'' کے اس انتہائی اہم مسئلہ کو خاطر خواہ اہمیت دی جارہی ہے۔ مگر اس کے حصول کے لیے جن حکمت عملیوں کو اختیار کیا جارہا ہے یا جائے گا وہ سطحی نہیں تو جامع بھی نہیں۔ مثلاً غذائی کمی کی پیمائش اور پیمائشی صلاحیت بڑھانے سے صرف اعداد و شمار

اکھٹا کرنے میں تیزی آئے گی، بھوک کے خاتمے میں نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ غذائی کمی سے نمٹنے کے لیے تکنیکی حل ڈھونڈھنے کی کوشش کی جارہی ہے جبکہ اس کے لیے ایک جامع سیاسی اور معاشی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھوک کے خاتمے کے لیے سب سے اہم کلیدی پالیسی زرعی زمین کی منصفانہ تقسیم ہے، جس کی طرف کوئی پیش رفت نظر نہیں آ رہی۔

دوسری طرف ''تحفظ خوراک کی قومی پالیسی'' پر زور دیا جارہا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شائد اسی پس منظر میں حکومت پاکستان نے ''قومی پالیسی برائے تحفظ خوراک و غذائیت تشکیل دی ہے۔ جس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حکومت پاکستان تحفظ خوراک کا حصول منڈی کے اصول کے تحت ہی چاہتی ہے۔ اس پالیسی کا زیادہ تر زور زراعت کو جدید صنعتی خطوط پر استوار کرنے اور پیداوار بڑھانے پر ہے۔ پوری پالیسی میں پائیدار زراعت پر کوئی نکتہ پیش نہیں کیا گیا۔ خدشہ ہے کہ مذکورہ پالیسی کا مقصد ملٹی نیشنل کمپنیوں کے غلبے کو مزید مستحکم کرنا ہے۔11

غذائیت اور تحفظ خوراک کی جب بھی بات ہوتی ہے نامیاتی مرکبات (micronutrients) کا ضرور ذکر ہوتا ہے۔ ایف اے او بھی خوراک میں اس کی کمی کو خاصی اہمیت دیتا نظر آتا ہے۔ تحفظ خوراک اور غذائیت کی پالیسی بھی اس کا ذکر کرتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر نامیاتی مرکبات کی کمی کی نشاندہی کی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ یہ کمی کیسے پیدا ہوئی؟ ہماری زمینوں میں ان نامیاتی مرکبات کی کمی کی وجہ بڑے رقبے پر ایک جیسی فصلوں اور بڑے پیمانے پر کیمیائی کھاد اور زہریلی ادویات کا استعمال ہے۔ اگر ایف او اور دیگر بین الاقوامی سرکاری ادارے واقعی غذائی کمی، خاص کرکے نامیاتی کمی کو دور کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ اعتراف کریں کہ سبز انقلاب پر مبنی صنعتی زراعت دراصل مسائل کی اصل وجہ سے اور اس لیے زراعت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے سارے فلسفے کو یکسر بدلنا پڑے گا۔ سرمایہ دارانہ زراعت کے فروغ کے لیے نامیاتی مرکبات کو دور کرنے کے لیے مصنوعی طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔ جس کے تحت کمپنیاں نامیاتی مرکبات پر مبنی ایک نئی منڈی تیار کریں گی اور بیش بہا منافع کمائیں گی۔

نیلی بڑھوتری (Blue Growth)

نیلی بڑھوتری سے مراد سمندر، دریا اور ساحل سے تیز، پائیدار اور جامع اقتصادی خاص کر روزگار کی ترقی سے ہے۔ یہاں یاد رہے پائیداری سے مراد ''آنے والی نسلوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ نسلوں کی ضرورتوں کا حصول ہے۔''

نیلی معیشت (Blue Economy)

نیلی معیشت سے مراد ترقی پزیر ممالک کے لیے پائیدار ترقی کے حصول کے لیے ایک فریم ورک یا ڈھانچہ کی تشکیل ہے۔ یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جو مساوات کے تحت سمندری وسائل تک رسائی، انسانی ترقی اور سنگین قومی قرضوں کے بوجھ کے خاتمے کے لیے پیش کش ہے۔

Sustainable Development Knowledge Platform. "Blue Economy Concept Paper." Accessed from www.justainabledevelpment.un.org/index.php?page=view&nr=603&type=13&menu=203

(ب) چاول پر علاقائی حکمت عملی فیز II: چاول پر علاقائی حکمت عمل پر ملکی سطح پر عمل درآمد کا جائزہ۔

- چاول کی بنیاد پر زرعی نظام، محل وقوع کے بنیادوں پر ماحولیاتی خدمات اور ایشیاء میں اس کے موثر استعمال اور فراہمی کے ذریعہ خوراک اور غذائی تحفظ میں بہتری۔
- پائیدار بنیادوں پر چاول کی کاشت اور اس کے فروغ کے ذریعہ خوراک اور غذائیت کے حصول میں بہتری۔
- منڈی کو فروغ دیتے ہوئے ملکی سطح پر چاول کی پیداواری حکمت عملی کے ذریعہ غربت میں کمی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ چاول ایک اہم غذائی فصل ہے اور بہت سے ایشیائی ملکوں میں واحد غذائی فصل تصور کی جاتی ہے۔ تحقیق کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ مگر چاول پر خصوصی توجہ جینیاتی چاول کے فروغ اور چاول کی پیداوار پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے قبضہ کے لیے ہے تو یہ دنیا اور خاص طور پر ایشیاء کے کسانوں کے حق پر ڈاکے کے مترادف ہوگی کیونکہ چاول کی ہزاروں اقسام مقامی کسانوں نے صدیوں کے تجربہ اور تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے دریافت کی ہیں۔ آج اس اہم غذائی فصل کو ہائبرڈ بیج یا جینیاتی بیج تک محدود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ افسوس ہے کہ کسانوں کے کئی ہزار سال کے سنبھالے ہوئے بیجوں کے جینیاتی مواد کو استعمال کرتے ہوئے یہ کیمیائی جینیاتی بیج منڈی میں لائے جارہے ہیں۔ سائنسی تجربہ کی بنیاد پر تبدیلی کے ذریعہ یہ ڈاکہ کسی طور قابل قبول نہیں ہے۔

(ج) نیلی بڑھوتری

نیلی معیشت کے ذریعہ یکساں، مفید اور قدرتی وسائل کے پائیدار استعمال اور انتظام میں اضافہ:

- بہتر طرز حکمرانی، ماحولیاتی طریقہ کار اور مقامی سطح پر عمل درآمد کی بہتری کے لیے شراکتی عمل کے ذریعہ قدرتی وسائل کے پائیدار استعمال اور انتظام کار میں مدد۔

- چھوٹے کاشتکاروں کے لیے قدرتی وسائل کے استعمال اور ملکیت میں اضافہ۔
- غربت میں کمی، وسائل کے بہتر معاوضے اور خوراک کے تحفظ کے ساتھ ساحلی بستیوں کی خوراک کی پیداوار کو پائیدار طریقوں سے بڑھانا۔
- بین السرحدی مسائل مثلاً پانی، ماہی گیری، جنگلات میں پائے جانے والے کیڑے اور مال مویشی کی صحت کے انتظامی امور میں مدد۔

نیلی معیشت: سبز معیشت کے ساتھ ساتھ نیلی معیشت کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ نیلی معیشت کا خیال ہی منفرد لگتا ہے۔ جب قدرتی وسائل کا ذکر بطور مجموعی استعمال ہورہا ہے تو الگ سے سمندری وسائل اور آبی حیات کو انسانی ترقی کے حوالے سے جوڑنے سے کیا مراد ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ سطح زمین کے وسائل مثلاً زمین، پانی، جنگلات وغیرہ سے منافع کمانے کے بعد اب دھیان سمندر اور سمندر سے جڑے دیگر وسائل سے منافع کے حصول کی طرف مرکوز ہوئی ہے۔ نیلی معیشت کی عمل درآمد میں ماہی گیری، سمندری سیاحت، ایکوا کلچر (Aquaculture)، آبی پودوں یا حیوانیات کی پرورش، نمک اور اصلی موتی کی صنعت کا فروغ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ماحول دوست پائیدار، توانائی کے ذریعہ ماحولیاتی خدمات بھی نیلی معیشت میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال آبی حیات میں شامل ایلجی (algee) ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ ایلجی کی زیادہ پیداوار کرکے اس سے تیل حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی پیداوار ایسے تالابوں میں کی جائے گی جہاں پر نمکین پانی واقع ہے۔[12] خیال رہے کہ ایلجی بہت تیز رفتاری سے بڑھتا ہے۔ ہم قدرتی وسائل کا استعمال بڑے پیمانے پر کرتے ہیں تو ان کے فائدے مند خوبیاں بھی نقصان میں بدل سکتی ہیں۔ نیلی معیشت اس طرح کے کئی نئے تجرباتی طریقے توانائی، خوراک اور دیگر ضرورتوں کے لیے پیش کررہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کون کرے گا؟ یہ ٹیکنالوجیاں کس کی ملکیت ہوں گی؟ نیلی معیشت کے تحت آبی وسائل پر بین الاقوامی کمپنیوں کے عمل دخل کا بڑھائے جانے کا خدشہ ہے۔ پائیدار ترقی کے حوالے سے عالمی کانفرنس ریو پلس 20 اور اس کے بعد کے تمام عالمی حکمت عملیوں مثلاً پوسٹ 2015 اور پائیدار ترقیاتی اہداف (SDGs) کے مباحثوں میں بھی سمندر اور سمندر سے جڑے وسائل کے پائیدار استعمال کو فروغ دینے کی تجاویز شدت کے ساتھ دی جارہی ہیں۔ درحقیقت سمندری وسائل پر مقامی آبادیوں کا ہی حق ہے اس لیے اس کا پورا پورا اختیار اور قبضہ ان ہی آبادیوں کا ہونا چاہیے۔ تجارت اور منافع کے لیے سمندر اور ساحلی آبادیوں کا استحصال قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایف اے او اور دیگر عالمی ادارے اس حقیقت کا ادراک کریں کہ ان کی بنائی ہوئی حکمت عملی ناکام ہوچکی ہیں اور ہورہی ہیں۔ مگر وہ ہر بار اسے نئے انداز سے پیش کر دیتے ہیں۔ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ مقامی آبادیوں اور پسے ہوئے طبقات کی مشاورت سے ایک ایسی حکمت عملی تشکیل دی جائے جو دنیا بھر کے غذاء کے کمی اور شدید بھوک کے شکار افراد کے لیے غذائی خود کفالت کے حصول کو ممکن اور یقینی بنائے۔ جس کے لیے پائیدار زراعت کے اصولوں کو اپناتے ہوئے خوراک کی خودمختاری کے نظریہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ صرف خوراک کی خود مختاری کا نظریہ ہی آبادیوں کو اپنے وسائل پر قابض ہونے اور حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کو یقینی بناتا ہے۔ ضرورت زندگی کے تمام وسائل پر سب سے پہلا حق ان آبادیوں کا ہے جہاں سے یہ وسائل حاصل کیے جاتے ہیں۔ وسائل کے منصفانہ تقسیم کے بغیر کسی بھی قسم کے اہداف کا حصول ناممکن ہے۔ ایف او کو مسائل کا ادراک حقیقی معنوں میں کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ ادراک نہ ہو کہ مسائل کی جڑ موجودہ پیداواری نظام ہی ہے۔ تمام معاشی، سماجی اور طبقاتی ناہمواری یہیں سے جنم لیتی ہے۔

حوالہ جات

1. FAO. "Welcome Statement by Hiroyuki Konuma." 32nd FAO Regional Conference for Asia and the Pacific, Ulaanbaatar, Mongolia, 10-14 March, 2014.
2. FAO. "State of food and agriculture in Asia and the Pacific region, including future prospects and emerging issues." FAO Document No. APRC/14/2. Presentad at 32nd FAO Regional Conference for Asia and the Pacific, Ulaanbaatar, Mongolia, 10-14 March, 2014.
3. Ibid.
4. Ibid.
5. Ibid.
6. Ibid.
7. Ibid.
8. FAO. "Meeting farmers' aspirations in the context of green development." FAO Document No. APRC/14/5. Presentad at 32nd FAO Regional Conference for Asia and the Pacific, Ulaanbaatar, Mongolia, 10-14 March, 2014.
9. Ibid.
10. FAO. "Priorities for FAO activities in the Region." FAO Document No. APRC/14/7. Presentad at 32nd FAO Regional Conference for Asia and the Pacific, Ulaanbaatar, Mongolia, 10-14 March, 2014.
11. Ibid.
12. Gunter A. Pauli. "The Blue Economy: 10 years, 100 innovations, 100 milliion jobs." Paradigm Publications, New Mexico, USA, 2010.

پدرشاہی نظام :ماضی کی ایک جھلک

تحریر: ثنا شریف

دنیا میں ہونے والی تبدیلی کا عمل چاہے کسی بھی نظام کی بنیاد پر ہو رہا ہو، ان نظاموں میں عورتوں پر ہونے والے استحصال اور ظلم کی روش ہر معاشرے میں جاری رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ظلم و استحصال کی شکلیں ہر دور یا نظام میں مختلف ہو جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عورتوں پر ہونے والا استحصال اور حقوق کی عدم برابری ہمیں مختلف تہذیبوں اور ادواروں میں مستقل دکھائی دیتی رہی ہے ۔تہذیب کے ابتدائی دور میں عورتوں کی زراعت کے ساتھ گہری وابستگی کی بنیاد پر ان کو زراعت کا بانی کہا جاتا تھا، لہذا خوراک جیسی بنیادی ضرورت اور انسانی تخلیق کے عمل کو پورا کرنے کے وجہ سے اس کو طاقت کا محور ٹھہرایا گیا۔ جیسے جیسے تہذیبی عمل آگے بڑھا اور معاشرتی ڈھانچوں میں نئی ایجادات سامنے آئیں عورت کی خود مختاری کا خاتمہ ہوتا گیا اور نجی ملکیت کا تصور شروع ہوا۔ جب اوزاروں کا دور شروع ہوا ان کی ایجاد اور استعمال مردوں کے ذمے تھا۔ لہذا مردوں کے رتبے میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور اسی طاقت کے احساس پر انہوں نے عورتوں کو کمزور سمجھنا شروع کر دیا۔ ہتھیاروں کی ایجاد سے ترقی تو ہوئی پر دوسری طرف قدرتی وسائل پر قبضہ کی جنگوں کا بھی آغاز ہوا۔ اس طرح معاشرہ طبقاتی حصوں میں تقسیم ہوتا گیا اور عورتوں کے استحصال کی ابتداء ہوئی۔1

اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے باوجود بھی عورت اپنے حقوق کی جنگ لڑتی نظر آتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ آج کے معاشرے میں بھی عورتوں پر ظلم اور ان کا استحصال شدت سے جاری ہے۔عورت جب اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتی ہے تو اس کی آواز کو طاقت کے زور پر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عورت چاہے کسی بھی مذہب، معاشرے یا طبقے سے تعلق رکھتی ہوں ہمیں اس کی ماتحتی کی مختلف شکلیں ہر دور میں نظر آتی ہیں۔عورتوں کو ماتحت رکھنے کا تصور اور اس بنیاد پر اس کے ساتھ ہونے والے استحصال پر مبنی معاشرے کو ''پدرشاہی نظام'' کہا جاتا ہے۔

پدر شاہی نظام وہ نظام ہے جس میں مرد عورت پر براہ راست اور بل واسطہ سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر اپنی حاکمیت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے معاشرے کے قانون، روایتی ڈھانچوں اور اداروں میں مردوں کی ہی حکومت نظر آتی ہے۔عورتوں کو زندگی کے ہر معاملہ میں چاہے اولاد کی پیدائش ہو یا شادی، کسی بھی فیصلہ سازی کے عمل میں شریک کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر عورت اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتی ہے تو اس کو بے باک اور بے شرم جیسے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ آخر کیوں عورتوں کو تعلیم، صحت، جائیداد ،فیصلہ سازی جیسے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے؟ کیونکہ مرد عورت کو برابری کا حق دینے کی ہمت نہیں رکھتا ہے۔ معاشرے کا اعلی تعلیم یافتہ مرد چاہے وہ شوہر، باپ، بھائی کیوں نہ ہو عورتوں کے حقوق کی بات تو کرتا نظر آتا ہے پر اپنی عملی زندگی میں عورتوں کو ان کا جائز حق دینے کو تیار نہیں ہے۔ مرد عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند کر کے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے انتہائی غیرت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ گھر کے سربراہ کے آگے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے والی عورت کو نافرمان قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عورت نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ان اصولوں اور روایات کے مطابق مصالحت کی کوشش کرتی ہے جو معاشرہ اس پر مسلط کرتا ہے۔

پیش کردہ مضمون میں تاریخی ادوار سے چند قدیم تہذیبوں میں پدرشاہی نظام کے تحت عورتوں کو حاصل شدہ مقام پر نظر ڈالی گئی ہے کہ کس طرح تہذیبی ارتقائی عمل میں عورتوں کی حصہ داری کے باوجود عورت مسلسل کئی طرح کے مظالم اور استحصال کا شکار رہی ہیں۔

پدرشاہی نظام کا ارتقاء

پدر شاہی نظام مختلف معاشروں، طبقوں اور تاریخی ادواروں میں اپنی شکل تبدیل کرتا رہا ہے۔ پدرشاہی کے ارتقاء کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات سامنے آتے رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں کو صرف عورتوں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کو اپنا ماتحت رکھنے کے لیے یہ نظام پیدا کیا گیا ہے۔ اس نظام کی تمام ترسوچ ہمارے تنظیمی ڈھانچوں میں موجود ہے۔ فریڈریک اینگلیز لکھتے ہیں کہ معاشرے میں عورتوں کو ماتحت بنانے کی ابتداء نجی املاک کے تصور اور ترقی کے ساتھ شروع ہوئی۔2 ان کا کہنا تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب کسی بھی قسم کی صنفی بنیادوں پر امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے طبقوں کی تقسیم اور عورتوں کو ماتحت رکھنے کا تصور ترقی کے تصور کے ساتھ شروع ہوا۔ اینگلیز معاشرے کی ابتداء ان تین ادواروں سے کرتے ہیں۔

1۔ وحشت (Savagery)

2۔ بربریت (Barbarism)

3۔ تہذیب (Civilization)

عہد وحشت میں انسان جانوروں کی طرح زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اپنی خوراک جڑی

بوٹیوں سے حاصل کرتے تھے یا پھر جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اس عہد میں نسب عورت سے چلا کرتا تھا شادی اور نجی ملکیت کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ عہد بربریت میں جب لوگوں نے اشتراکی طور پر گروہوں کی صورت میں رہنا شروع کیا تو بڑے پیمانے پر خوراک کی ضرورت کے لیے مردوں کو شکار کی غرض سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے منتقل ہونا پڑتا تھا۔ جبکہ عورتیں اپنے علاقے اور بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے گروہوں کی قیام گاہ میں ہی رہتی تھی۔ جب انسان نے جانوروں کو پالنا شروع کیا اور جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی تو بڑے پیمانے پر ان گروہوں کے درمیان میں وسائل کے حصول کے لیے لڑائیوں کا آغاز ہوا۔ اس غرض سے مختلف قسم کے ہتھیار ایجاد ہوئے اورغلامی کا تصور ابھرا۔ جانوروں اور غلاموں (خاص کر غلام عورتوں) کو حاصل کرنے کے لیے جنگیں بھی ہونے لگی۔ اسی بنیاد پر صنفی تقسیم کی سوچ پیدا ہوئی۔

مردوں نے طاقت کے حصول کے لیے جانوروں اور غلاموں کی صورت میں مال و دولت جمع کرنا شروع کر دیا۔ مال و دولت کے اس تصور نے ''نجی ملکیت'' کے تصور کو فروغ دیا۔ مردوں نے اپنی طاقت اور املاک کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی دولت اولاد کو منتقل کرنا شروع کر دی۔ اس وراثت کو یقینی بنانے کے لیے ماں کے حقوق کو یکسر بدل کے رکھ دیا گیا۔ باپ کے حق کو قائم کرنے کے لیے شادی کے تصور کو قائم کیا گیا تاکہ عورت کو جنسی طور پر ایک مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کا پابند کیا جاسکے اور ساتھ ہی وراثت کی منتقلی کے لیے اس مرد کی اولاد کا یقینی ہونا ضروری بنایا جاسکے۔ اس دور میں ان وجوہات کی بناء پر مردانہ حاکمیت اور شادی کا تصور قائم ہوا۔ کیونکہ پیداوار کے مختلف ذرائع پر مرد قابض تھے لہذا عورتیں معاشی طور پر مرد کی محتاج تھیں۔ اینگلیز کے مطابق جدید تہذیب میں ریاست کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب خاندان کی نوعیت بدلی تو عورت کی سماجی پیداوار میں شرکت کے باوجود اسے تمام تر عمل سے خارج کر دیا گیا۔ عورت کی حیثیت گھر اور خاندان کے لیے نجی خدمتگار کی ہوگئی۔ اس طرح پدرانہ خاندان کی ابتداء ہوئی۔[3]

یونانی تاریخ

323 سے 520 قبل از مسیح کے دورانئے کو ابتدائی یونان کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔[4] اس عہد کی دو اہم ریاستوں اسپارٹا (Sparta) اور ایتھینین (Athenian) میں عورتوں کے حقوق میں نمایاں تفریق نظر آتی ہے۔ اسپارٹا معاشرے میں خاندان سے زیادہ ریاست اہم تھی۔ جس کے دفاع کے لیے ضروری تھا کہ مرد صحت مند، طاقتور اور جنگجو ہو۔ اس مقصد کے لیے لڑکوں کو سات سے 30 سال کی عمر تک کیمپوں میں رکھا جاتا تھا۔اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ گھر میں مرد کی حیثیت کم اور عورتوں کی حیثیت مضبوط ہوئی۔ اس کے علاوہ اسپارٹا کی عورتوں کا مقصد ریاست کے دفاع کے لیے مرد فوجیوں کو پیدا کرنا تھا۔لڑکیاں بھی مردوں کی طرح جسمانی ورزش اور کھیلوں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔عورتوں کو موروثی جائیداد میں ملکیتی حقوق، خرید و فروخت کا تعلیم حاصل کرنے، مذہبی جلوسوں میں جانے اور رقص کرنے کی اجازت تھی۔ جنگوں کے اوقات میں عورتیں اپنے شوہروں کی جائیداد کی نگران کار ہوا کرتی تھی۔[5] دوسرے لفظوں میں کیونکہ ریاست کو مضبوط ترین بنانا اول ہدف تھا اس لیے عورتوں کو اس ہدف کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا جو ان کے لیے معاشرے میں ایک بہتر نظام فراہم کرسکا۔

اس کے برعکس ایتھینین معاشرہ بالکل جدا تھا۔ اس معاشرہ میں علمی، ادبی، ثقافتی اور سائنسی علوم کی ترقی کو فروغ ہوا۔ اس میں عورتوں کو مختلف حقوق کے حوالے سے نظرانداز کیا گیا۔عورت کی تعلیم کے بارے میں خیال یہ تھا کہ ''عورت کو پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے سانپ کو اور زہر آلود کر دیا جائے۔''[6] وہ کورٹ میں بحیثیت جج اور فریق پیش نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس دور میں عورتوں کے جرم میں ملوث ہونے کے شواہد بہت کم ملتے تھے۔ لہذا کسی معاملے میں ان کی گواہی کی ضرورت درپیش ہوتی تو خصوصی کاروائی کے تحت ان کا بیان قلمبند کروایا جاتا تھا۔ عورتوں کو موروثی جائیداد میں ملکیت کا حق حاصل نہیں تھا۔ عورت کو بچے کی تخلیق کا ذمہ دار نہیں ٹہرایا جاتا تھا بلکہ عام خیال یہ تھا کہ وہ بچہ تو پیدا کرتی ہے مگر اولاد کی حقدار نہیں کیونکہ یہ مرد کا بیج ہے جو وہ اپنے رحم میں رکھتی ہے۔ ان کے تمام قانونی معاملات ان کے نگران کار باپ/ شوہر کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ عورت کی شادی کے بعد اس کے والدین سے تعلقات ختم ہوجاتے تھے۔ سیاسی حوالے سے وہاں کی عورت کوئی حقوق حاصل نہیں کرسکی تھی۔ نہ وہ ووٹ دے سکتی تھی اور نہ ہی اسمبلی کی ممبر بن سکتی تھی۔

ایتھینین معاشرہ زراعت پر مبنی تھا اس لیے زمین کی اہمیت تھی اور کوشش کی جاتی تھی کہ زمینی جائیداد کسی دوسرے خاندان میں نہ جائے۔ اس لیے لڑکیوں کی شادی 18-16 سال کے درمیان کر دی جاتی تھی تاکہ وہ جلد سے جلد خود کو مرد کی مرضی کے مطابق ڈھال لیں۔ لیکن دوسری طرف مرد طوائفوں اور کنیزوں کو اپنی خدمت کے لیے رکھا کرتے تھے۔ غریب افراد اس وقت کے امراء کو اپنی لڑکیاں معاہدوں کی صورت میں دیا کرتے تھے۔ معاہدے میں دی جانے والی عورت صرف اسی شخص کے ساتھ جنسی تعلقات کی پابند ہوتی تھی، یہ عورت اس مرد کی اولاد پیدا کرکے اس کی پرورش کرنے کا حق تو رکھتی تھی پر موروثی جائیداد میں اس کا اور اس کی اولاد کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اگر اس مرد کو عورت کے کسی اور کے ساتھ تعلقات کا شبہ ہوتا تو وہ اس کو قتل کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس مد میں وہ جرمانہ اور اس کو بطور کنیز فروخت بھی کرسکتا تھا۔

عورت کی سماجی زندگی کو گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا گیا تھا اور

گھر سے باہر جا کر خریداری اور کسی بھی طرح کی محفل میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ان کے لیے علیحدہ حصہ مقرر ہوتا تھا۔ بچوں کی پرورش سے لے کر تمام گھریلو ذمہ داریاں عورتوں کے سپرد تھیں۔ غریب طبقہ کی زیادتر عورتیں زراعت کے پیشے سے وابستہ تھیں جبکہ کچھ اپنے علاقوں میں دکان داری کے فرائض نبھاتی تھیں۔ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتیں اپنا زیادہ وقت مذہبی سرگرمیوں میں گزارہ کرتی تھیں۔ امیر طبقہ کی عورتیں کھانا پکانے اور قالین کی بنائی جیسے کاموں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔7

رومن تاریخ

509-264 قبل از مسیح میں رومن جمہوریہ کے آغاز کے وقت چند طبقات واضح نظر آتے ہیں۔8 پٹریشینز (Patricians)، پلیبینز (Pelbeians) اور غلام۔ پٹریشینز اس وقت کے اشرافیہ اور جمہوریہ رومن کے بانی مانے جاتے تھے۔ یہ طبقہ اقلیت میں تھا لیکن اس میں بڑے جاگیردار، مجسٹریٹ اور تاجر شامل تھے۔ پلیبین طبقہ کے زیادہ تر لوگ مزدور اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد سب سے کم طبقہ جس کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے غلاموں کا سمجھا جاتا تھا۔ یہ طبقہ زراعت اور دستکاری کے پیشوں سے وابستہ تھے۔9

رومن معاشرے کو سمجھنے کے لیے اس کے سماجی ڈھانچہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس دور میں ''شہریوں کے حقوق'' کو واضح برتری دی گئی تھی۔ اس معاشرے میں شہریوں اور غیر شہریوں کی مختلف اقسام پائی جاتی تھی۔ شہریوں میں پٹریشینز، پلیبینز شامل تھے۔ جبکہ غلاموں کو غیر شہری تسلیم کیا جاتا تھا۔ رومی تاریخ کے ساتھ ساتھ رومن شہریوں کے حقوق میں تبدیلی آتی گئی۔ انہیں جائیداد کی ملکیت اور معاہدوں کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ حکومتی محصولات سے بھی ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس طبقہ کو شہری حقوق کی بنیاد پر سیاسی عمل کا حصہ بنتے ہوئے ووٹ ڈالنے کا حق بھی حاصل تھا۔10

بیان کردہ قدیم رومن تاریخ کے سماجی ڈھانچے میں عورت کی تمام تر زندگی مرد کی ماتحتی کے گرد گھومتی ہے لیکن یونانی عہد کے مقابلے رومن دور حکومت میں عورتوں کا سماجی رتبہ کچھ بہتری کی طرف دکھائی دیتا ہے کیونکہ رومی عورتوں کو یونانی عورتوں کے مقابلے موروثی جائیداد میں ملکیتی حقوق کے ساتھ اپنے شوہر سے طلاق کے لیے رجوع کا حق بھی حاصل تھا۔ طلاق کی صورت میں عورت اپنے بچوں کی تحویل کا حق کھو دیتی تھی۔ اس معاشرے میں عورتوں کی جلدی شادی کا رواج عام تھا۔ رومن عورتیں اپنی مرضی سے شوہر کا انتخاب نہیں کر سکتی تھی یہ ذمہ داری ان کے نگران کار پوری کرتے تھے۔ رومنوں کو شدت سے خیال تھا کہ انسانی زندگی موت کے ذریعے ختم نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ بچوں کی مسلسل پیدائش کے ذریعے زندگی چلتی رہنی چاہئے۔ اس لیے عورت کا زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا بڑا کام سمجھا جاتا تھا۔ بچوں کی کثرت سے پیدائش کے سبب بہت سی عورتیں موت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اگر کوئی عورت طبی نقص کے باعث بانجھ ہوتی تو اس کو طلاق کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ طبقے کی عورت کے لیے ضروری تھا کہ وہ ممکن حد تک بچے پیدا کرے۔ جبکہ نچلے طبقے میں بچے پیدا کرنا اہم تو سمجھا جاتا تھا پر بہت سارے بچوں کی پیدائش پر اصرار نہیں کیا جاتا تھا۔

رومی قوانین میں نگران کار مرد کے حقوق، جائیداد کے حقوق، عورتوں کے طرز لباس کے حوالے سے قوانین وضوابط شامل تھے۔ قدیم رومی عقائد کے مطابق تمام عورتوں کا اپنے نگران کار باپ اور بھائی کی دسترس میں ہونا ضروری تھا۔ اس کی یہ حیثیت روایتی طور پر باپ سے شوہر اور پھر اولاد تک منتقل ہوتی رہتی تھی۔ عورتیں سیاست سے دلچسپی رکھ سکتی تھیں پر سیاسی طور پر اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کی قانونی اجازت ان کو حاصل نہ تھی۔ وہ اپنے نگران کار کی مرضی کے بغیر کسی بھی قسم کے کاروباری لین دین کا نہ تو حصہ بن سکتی تھیں اور نہ ان کو کسی بھی معاہدے کا زامن تسلیم کیا جاتا تھا۔11

یوں ان عورتوں کے حقوق قانون سازی کے حوالے سے محدود کر دیے گئے تھے پر ان کی سماجی زندگی یونانی عورتوں کے حوالے سے بہتر تھی۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع تو حاصل تھے پر مردوں کے مقابلے ان کو یکساں تعلیم سے محروم رکھا گیا۔ عورتوں کی فیصلہ سازی کی طاقت صرف ان کے گھر کے انتظامی حوالے تک محدود تھی۔ یونانی معاشرے کی نسبت رومن معاشرے میں عورتوں کی سماجی سرگرمیوں کو برائی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ وہ مختلف قسم کے میلوں اور مذہبی تہواروں میں اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہو سکتی تھی پر اس حوالے سے کچھ سخت قوانین ان پر لاگو ہوتے تھے مثلاً قانون کے تحت عورتوں کی شراب نوشی کی سختی سے ممانعت تھی۔12

مصری تاریخ

قدیم مصری تاریخ میں دیگر تہذیبوں کے بہ نسبت عورتوں کو سماجی، اقتصادی اور معاشی طور پر مردوں کے برابر یکساں حقوق حاصل تھے۔ برطانوی آرکیولوجسٹ/ اجپٹولوجسٹ (Archeologist/Egyptologist) جوائس ٹیلڈ لیسلے (Joyce Tyldesley) کے مطابق مصری معاشرہ زندگی گزارنے کے لیے بہت بہتر تھا۔ خاص کر عورتوں کے لیے کیونکہ یہ معاشرہ مساوات اور برابری کی بنیاد پر قائم تھا جس میں عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق فراہم کیے گئے۔13

لیکن قدیم مصر میں عورت کی اصل حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس وقت کی سماجی درجہ بندی کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان سماجی درجہ بندیوں میں مختلف طبقات

شامل تھے مثلاً شاہی خاندان، اشرافیہ طبقہ، فن کار، ہنرمند، کسان اور غلام۔ معاشرہ کے سماجی اور معاشی حقوق ایک طبقے تک محدود تھے اور دیگر طبقات کو محروم رکھا گیا تھا۔ قدیم مصر کے غلامانہ اور جاگیردارنہ اقتصادی نظام میں جہاں جائیداد بہت معنی رکھتی تھی عورت کی ملکیتی مانی گئی اور وہ اپنے اس حق کی قانونی چارہ جوئی کے لیے عدالت سے رجوع کرسکتی تھی۔ اعلیٰ طبقہ کی عورت صاحب جائیداد ہونے کے علاوہ اپنے شوہر کے اختیارات کو بھی استعمال کرسکتی تھی اور شوہر کی موت کے بعد اس کی کل جائیداد کی ایک تہائی کی وارث ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ باقی دو تہائی جائیداد کو صرف کرنے کی فیصلہ سازی بھی اس کے پاس تھی۔ عورت کی حیثیت کا تعین اس کے طبقہ سے ہوا کرتا تھا، نچلے طبقوں کی عورتیں ان مراعات سے محروم تھیں۔[14]

قدیم مصر میں شادیاں معاہدوں کے تحت ہوا کرتی تھی۔ گوکہ ان معاہدوں کے اندراج کے کوئی تحریری شواہد موجود نہیں ہیں لیکن خیال ہے کہ ان معاہدوں کے تحت عورت کے اقتصادی اور معاشی حقوق کی حفاظت کی گئی تھی۔ شادی طے ہوجانے کے بعد لڑکی کے والد کو رقم دے دی جاتی تھی۔ ان معاہدوں کی صورت میں شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے خرچ کا پابند ہو جاتا تھا۔ طلاق کا رواج عام تھا، طلاق کی وجوہات میں پسند ناپسند، عورت کا بانجھ ہونا اور امراء مرد حضرات کا دوسری شادی کرنا شامل تھا۔[15]

دوسری قدیم تہذیبوں کی نسبت مصر قدیم میں عورتوں کو سماجی طور پر گھر سے باہر نکلنے کی آزادی تھی۔ اعلی طبقے کی عورتیں پیشہ وارانہ عہدوں پر فائز تھیں جبکہ درمیانے طبقے کی عورتوں کا کام گھر اور خاندان تک محدود تھا۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتیں کام کرتی تھیں مثلاً کسان اور کنیز کے طور پر۔ اس طبقے کی عورتوں کا کام سخت مشقت طلب تھا۔ قانونی طور پر عورتیں مردوں کے مساوی تسلیم کی جاتی تھیں لیکن نچلے طبقے کی بیوہ عورتوں کا گھر سے نکلنا غیر محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ عورت کا وجود اور اس کی حیثیت مرد کی ذات سے تسلیم کی جاتی تھی۔

تاریخ ہند

قدیم ہندوستان میں عورت کی حیثیت ہندو تہذیب وتمدن کی تبدیلیوں اور اس کے ارد گرد روایات سے جڑی نظر آتی ہے۔ جیسے جیسے ہندوستان تہذیبی عمل کی طرف بڑھتا گیا ویسے ہی عورتوں کے لیے سماجی امتیاز میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستانی تاریخ کو ویدک (Vedic) دور سے شروع کیا جاتا ہے۔[16] جو کہ 500-1500 قبل از مسیح کا دور تھا، اس دور میں مردوں اور عورتوں کو تعلیم، مذہب اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں برابری کے حقوق حاصل تھے۔ دیویاں دیوتاؤں کے مقابلہ زیادہ اہم تھیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاشرے میں عورتوں کو مساوی مقام حاصل تھا۔ ویدک دور کے ابتدائی حصہ میں عورتوں کو تعلیم دینے کا رواج تھا۔ عورتیں ویدوں کی تعلیمات، فلسفہ اور شاعری میں ماہر ہوا کرتی تھیں۔ اس دور میں بیوہ عورتیں دوبارہ شادی کرنے کے حق کے علاوہ مذہبی تقریبات اور قبائلی اجلاسوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ویدوں کے ابتدائی دور میں عورت کی شادی 16 سال کی عمر تک نہیں کی جاتی تھی اور شادی کے بعد اپنا گھر تبدیل نہیں کرتی تھی۔ اس دور کی روایات کے مطابق شوہر اور بیوی مشترکہ جائیداد کے مالک ہوتے تھے۔ لیکن عملی طور پر جائیداد کا مالک شوہر ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں ہی عورتوں کی شادی کے حوالے سے یہ عقیدہ تھا کہ شادی کے بغیر عورت جنت میں نہیں جاسکتی اور اگر کوئی عورت شادی کیے بغیر مر جائے تو اس کے جسم کو جلانا چاہئے۔ چنانچہ عورتوں کی شادی کی عمر کم کرکے 9 سے 10 سال کر دی گئی۔ ویدک کے ابتدائی دور میں ''سوئمبر'' (swamvara) کی رسم کے تحت عورت اپنی مرضی سے شوہر کا انتخاب کرتی تھی لیکن بعد میں یہ رسم صرف امراء طبقے تک محدود رہ گئی۔[17]

قدیم ہندوستان میں عورتوں کی حیثیت میں تبدیلی کے عمل کے بارے میں وثوق سے کہنا مشکل ہے پر ویدک دور کے آخری اوائل 1000-1500 قبل از مسیح میں بتدریج یہ تبدیلیاں آریائن(Aryans) کے دور میں دکھائی دینا شروع ہوئیں۔[18] دریائے سندھ کی تہذیب کے ختم ہونے پر آرئین تہذیب کی شروعات ہوئیں۔ آرئین تہذیب چار ذاتوں پر مبنی تھی جن میں برہمن ذات اول درجہ پر تھی۔ ان میں برہمن پنڈتاور دانشوروں کے مرتبہ پر فائز تھے۔ برہمن ذات نے عبادت گاہوں میں پوجا پاٹ کو پیشہ بنا لیا اور عورتوں کو اپنے مفادات کے لیے اس سارے عمل سے علیحدہ کر دیا۔ عورتوں پر تعلیم کے دروازے بند اور مذہبی مقامات پر ان کے بھجن گانے پر پابندی لگادی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی آزادی کم کی جانے لگی۔ انہیں معاشرے کے سیاسی معاملات میں اظہار رائے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ گھریلو کاموں تک محدود کر دیا گیا تھا۔[19]

قدیم بھارت میں بیواؤں کی شادی کی اجازت نہ تھی بلکہ بیوہ عورتوں کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ سادہ لباس پہننے اور علیحدہ کھانا کھانے اور خوشی کی تقریبات میں شرکت نہ کرنے کی پابند تھیں۔ بیوہ عورتوں کو ''ستی'' (sati) کرنے کا رواج عام تھا۔ اس رسم کے مطابق بیوی کو شوہر کی چتا کے ساتھ جل کے اپنے آپ کو وفادار بیوی ثابت کرنا پڑتا تھا۔[20] اس کے علاوہ عورتوں کو دیوداسی (devadasi) بنانے کا بھی رواج تھا۔ اس کے تحت لڑکیوں کو دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر مندروں کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں آریاؤں کے تسلط کے بعد عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کے بہت سے شواہد ملتے ہیں۔ جن میں بچیوں کی کم عمری میں شادی، جہیز کا نظام، جائیداد کے وراثتی حق سے محرومی، شوہر کی پیشگی اجازت کے بغیر گھر چھوڑنے پر عورت کے ناک اور کان کاٹ دینا، شوہر کی موجودگی میں اکیلے سونے کی اجازت نہ ہونا، بیوہ عورتوں کے بالوں کو سوگ کے نشان کے طور پر منڈوا دینا اور عورت کو

جھوٹے الزاموں میں بد کردار ثابت کر کے جلانے اور سزائے موت کی فرسودہ رسمیں نظر آتی ہیں۔21 آریوں کے آمد کے بعد ذات پات کا نظام مضبوط ہوا۔ ذات پات کے گرد سخت قسم کے قوانین موجود تھے۔ مختلف ذاتوں کے درمیان شادیوں اور ساتھ کھانے پینے کی ممانعت تھی۔ ذات پات کی تفریق نے پاکی اور ناپاکی کے تصورات کو مضبوط کیا۔ اسی تفریق نے عورتوں کے مقام اور معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ اسے مختلف مذہبی رسومات کی ادائیگی سے روک دیا گیا اور اس کا ثقافتی اور سماجی کردار بھی مختلف طریقوں سے کم کر دیا گیا۔22 ہندو تہذیب میں فرسودہ روایات اور جہالت کی بنیاد پر عورتوں کی حیثیت کم کر کے انہیں مرد کی ملکیت بنا دیا گیا۔

چینی تاریخ

چینی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس دور کے سماجی درجہ بندی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ قدیم چین میں اگر عورت کی حیثیت پر نظر ڈالی جائے تو عورت کا وجود کبھی بھی مرد کے برابر تسلیم نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے حوالے سے یہ نقطہ نظر چند سالوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سوچ قدیم چین کی سماجی بنیاد کا حصہ تھی۔ عورت کو اس کے پیدا ہوتے ہی مردوں کے مقابلے کم تر ٹھہرایا جاتا تھا۔ عورتیں اپنے باپ، شوہر، بھائی اور بیٹوں کی ماتحتی میں زندگی گزارہ کرتی تھی۔ 256-1046 قبل از مسیح میں چینی معاشرہ چار طبقات پر مشتمل تھا۔ ان چار طبقات میں بادشاہ، کسان، دستکار اور تاجر شامل تھے۔ سماجی طور پر سب سے اعلی طبقہ میں بادشاہوں اور ان کے شرفاء کے خاندانوں کو شمار کیا جاتا تھا۔23

چینی معاشرے میں عورتوں کے حقوق عملی طور پر غیر رائج تھے۔ عورتیں مردوں کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق زندگی گزارتی تھیں۔ جبری طور پر عورتوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ مختلف فرسودہ سماجی روایات کی پابندی کریں مثال کے طور پر لڑکیوں کے پانچ سے چھ سال کی عمر میں پاؤں باندھنے کا رواج عام تھا۔ کیونکہ وہاں کے مرد اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایسا کرنے سے عورتیں مزید پر کشش ہو جاتی ہیں اور آگے زندگی میں ان کے دولت مند آدمی سے شادی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ بہت سے غریب خاندان اپنی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے اس رواج کو اپناتے تھے پھر آہستہ آہستہ یہ رواج تمام طبقوں میں پھیلتا گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں کے پاؤں باندھنے کا عمل غیر قانونی تسلیم کیا جانے لگا۔ قدیم چین میں عورتوں کو کسی بھی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت حاصل نہیں تھی۔ ان کی ذمہ داریوں میں گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور قالین کی بنائی جیسے کام شامل تھے۔ شادی کے معاملات میں بھی وہ اپنے ماتحتی کے حکم کی پابند تھیں۔ مرد شادی کے بعد بھی قانونی طور پر کئی رکھیلوں کو رکھ سکتا تھا اور ان سے اولاد بھی پیدا کر سکتا تھا۔ عورت اس حوالے سے کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ عورتوں پر ذہنی دباؤ ڈالا جاتا تھا کہ وہ صرف بیٹے ہی پیدا کریں جو کہ ان کے بس میں نہیں تھا۔ طلاق کو بہت سے معاملات میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اگر کوئی عورت طلاق کا مطالبہ کرتی تھی تو وہ خاندان کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ عورت طلاق حاصل کرنے کے بعد سماجی طور پر تنہا کر دی جاتی تھی۔24

کسانوں کا طبقہ اس وقت سب سے زیادہ غریب شمار کیا جاتا تھا۔ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے پورے خاندان کو کام کا حصہ بننا پڑتا تھا۔ عورتوں کو بھی بندھے ہوئے پیروں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پاؤں بندھے رہنے کا عمل چونکہ کافی تکلیف دہ ہوتا تھا اگر عورتیں کھیتوں میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہ پاتیں تو وہ اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل پر کام کرنے پر مجبور ہوتی تھیں۔ اس سارے عمل میں عورت بالکل بے اختیار اور اپنے خاندان کا حکم ماننے کی پابند تھی۔ خاندان کو شرمندگی سے بچانے کے خوف میں اس حکم پر عمل کرتی تھی۔25

قدیم چین کی تہذیب کا عقیدہ تھا کہ عورتیں گھر سے باہر رہ کر اپنے کسی عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتی ہے۔ ان کے پیدا ہونے کا مقصد صرف مردوں کی خدمت پر مامور رہنا ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر عورتوں کے ساتھ غلاموں جیسا برتاؤ پدررانہ نظام کی عکاسی کرتا تھا۔

مختلف ادواروں کی تہذیبوں میں عورت کا مقام ہمیشہ ثانوی بنیادوں پر ہی قائم رہا ہے۔ پیش کردہ مضمون میں جتنی قدیم تہذیبوں پر روشنی ڈالی گئی ان میں سے زیادہ تر نے عورت کو صرف اپنے فوائد اور مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ گو کہ قدیم مصر میں عورتوں کے حقوق مانے گئے لیکن اس معاشرے میں بھی عورتیں طبقاتی بنیاد پر عدم برابری کا شکار رہی ہیں۔

مضمون کی ابتداء میں پدرشاہی کے ارتقاء کو اینگلز کی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیبی عمل اور طاقت کی غیر منصفانہ تقسیم نے عورت کو نجی ملکیت کا حصہ بنا دیا۔ اور اسکے نتیجے میں عورت کی آزادی اور خودمختاری کے خاتمے کے ساتھ اسے مرد کی ماتحتی میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ماضی کے جائزے کے بعد اگر حال میں ان نام نہاد ترقی یافتہ زمانے پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اس پدرشاہی کے علاوہ بھی دو نظام ایسے نظر آتے ہیں جو عورت کی زندگی پر مختلف شکلوں میں ظلم اور استحصال کی روایت کو قائم رکھ رہے ہیں۔ یہ نظام سرمایہ داری اور جاگیرداری کہلاتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام میں گو کہ عورت تمام پیداواری عمل میں برابر کا حصہ لے رہی ہے پر اس کی محنت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسے ہر بنیادی سہولت اور فیصلہ سازی کے حق سے محروم کر کے مرد کی جاگیر قرار دے

دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام عورت کو خود مختار بنانے کا دعوی تو کرتا ہے مگر مرد مزدور کے مقابلے اسکی صلاحیتوں کو کم گردانتے ہوئے کم سے کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اسکے علاوہ عورت سے نہ صرف مزدور کی حیثیت سے کام لیتا ہے بلکہ گھر کی ساری ذمہ داریاں بھی عورت پوری طرح سنبھالے رہتی ہے۔ غرض کہ یہ دونوں نظام اپنے منافع اور مقاصد کے عورت کا استعمال کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عورت کو اپنے مقاصد کے لئے قربان کیا جائے گا تو مرد کی کبھی یہ خواہش نہیں ہوگی کہ عورت کو مساوی درجہ حاصل ہو۔جس سماج اور جن نظاموں میں ہم زندگی گزار رہے ہیں ان رائج شدہ نظاموں کی بنیاد ہی تقسیم اور طبقہ کی سوچ پر مبنی ہے تو پھر تقسیم ہر طرح کی نظر آتی ہے۔ وسائل، سرمایہ یا پھر مرد اور عورت کے درمیان رشتوں کی۔ہمیں ان نظاموں کو بدلنے کی کوشش کرنی ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے کے ہر شے اور انسانی رشتے مادی فوائد کی نظر ہوگئے ہیں ۔یہ تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب ہم انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی طور پر ان نظاموں میں چھپے استحصال کو سامنے لائیں اور انکے خاتمے کے لئے برابری کی بنیاد پر منصفانہ تقسیم کی ایسی راہ تلاش کریں جو طبقاتی فرق کے خاتمے کا باعث ہو۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخ اور عورت''۔ چوتھا اضافی ایڈیشن،ارتقاء انسٹیوٹ آف سوشل سائنسز، 2010۔

2. Bhasin, Kamla. "What is Patriarchy?" Delhi, Kali for Women. 1993, p. 23.

3. Ibid.

4۔ ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخ اور عورت،'' صفحہ 10۔

5. Thompson, James, C. "Women in Sparta." July 2010. Accessed from http://www.womenintheancientworld.com/women%20in%20sparta.htm

6۔ ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخ اور عورت،'' صفحہ 149۔

7. The British Museum. "Women, children and slaves: background information 19." Accessed from http://www.ancientgreece.co.uk/staff/resources/background18/home.html

8. Encyclopaedia Britannica. "Roman Republic." Accessed from http://www.britannica.com/EBchecked/topic/857952/Roman-Republic

9. Kries, Steven. "The History guide: Lectures on ancient and medieval European history, Lecture 11." Republican Rome, 509 -31BC Accessed from www.historyguide.org/ancient/lecture11b.html

10. Ancient History Encyclopedia. "The Roman Republic." October 2012. Accessed from www.ancient.eu.com/Roman_Rublic/

11. Mason, Moyak, K. "Ancient Roman women: A look at their lives." Accessed from www.moyak.com/papers/roman-women.html

12. Alchin, L. K, "Roman women." Accessed from www.tribunesanstriumphs.org/roman-life/roman-woman.htm

13. Beth, Button. "The women of ancient Egypt." Accessed from members.tripod.com/~Button_B/

14. Crystals, Ellie. "Women in ancient Egypt." Accessed from http://schools.yrdsb.ca/markville.ss/projects/classof2007/16chong/kim/Women%20in%20Ancient%20Egypt.htm

15. Ancient History Encyclopedia. "Women in ancient Egyptian society." January 2014, Accessed from http://www.ancient.eu.com/article/623/

16. History Book. "Ancient India Module1: The Vedic age (1500-600 BC)." Accessed from download.nos.org/srsec315new/History%20Book_L04.pd

17۔ ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخ اور عورت،'' صفحہ 138۔

18. International World History Project. "Early India the Asian way of life." Accessed from history-world.org/india1.htm

19۔ ڈاکٹر مبارک علی ''تاریخ اور عورت،'' صفحہ 138۔

20. Heaphy, Linda. "Life in India: The practice of Sati or widow burning." Accessed from www.Kashgar.com.au/articles/life-in-india-the-practice-o-sati-or-widow-burning

21. Kumar, Abhishek. "Life of women in ancient India." November 2009. Accessed from http://abhisays.com/india/life-of-women-in-ancient-india.html

22. Nair, Sanjay. "Women in Hinduism: Rise of womanhood." Accessed from http://www.rise-of-womanhood.org/women-in-hinduism.html

23. Rover, Globe. "Ancient China social classes." March 2010. Accessed From globerove.com/china/ancient-china-social-classes/2413

24. Inong Joan. "Womens rights in ancient China." September 2008. Accessed from http://www.lifepaths360.com/index.php/womens-rights-in-ancient-china-13182/

25. Salmon, Rod. "Daily life of women." October 2005. Accessed from http://www.skwirk.com/p-c_s-14_u-173_t-472_c-1711/act/history/ancient-societies-china/ancient-china-part-ii/daily-life-of-wome

پاکستانی نوجوان اور تعلیم

تحریر: علی احمد جان

وہ تمام افراد جن کی عمریں 15 سے 29 برس کے درمیان ہوں، یوتھ یعنی نوجوان کہلاتے ہیں۔ انھیں معاشرے کا سب سے فعال اور چاق و چوبند حصہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ عمر کے اس حصے میں انسان مسلسل زیادہ ذہنی وجسمانی محنت کرسکتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ نوجوان نسل ملک و قوم کا بیش بہا اثاثہ ہوتی ہے۔ اسے فرض شناسی اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاکر صحیح سمت کی طرف رواں کیا جائے تو نہ صرف ہر شعبہ ہائے زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکتی ہے بلکہ ملک کی سیاسی، معاشی و معاشرتی ترقی میں نئی تاریخ رقم ہوسکتی ہے۔

پاکستان کو نوجوانوں کی تعداد کے اعتبار سے خوش قسمت ملک تصور کیا جاتا ہے کیونکہ ملک کی کل آبادی کا 27 فیصد حصہ (41.81 ملین) نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی کے ہر پانچویں فرد کی عمر 15 سے 24 سال کے درمیان ہوتی ہے۔ حکومت پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب 50 فیصد ہے۔ نوجوانوں کا 67 فیصد حصہ دیہی اور 33 فیصد شہری علاقوں میں رہتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق نوجوانوں کا 37 فیصد حصہ (15.57 ملین) اسکول نہیں جاتا مگر آزاد زرائع کے مطابق یہ تعداد 2 کروڑ 70 لاکھ ہے۔[1] تین سال سے پانچ سال کی عمر کے 65 فیصد بچے خیبر پختون خواہ، 61 فیصد سندھ، 78 فیصد بلوچستان اور 50 فیصد پنجاب میں اسکول میں داخل نہیں ہوتے۔ چھ سال سے 16 سال کی عمر کے 23 فیصد دیہاتی اور سات فیصد شہری علاقوں کے بچے اسکول نہیں جاتے (فیگر 1)۔

پاکستانی نوجوان آج ان گنت مسائل میں پھنسا ہوا ہے مثلاً بے روزگاری، غربت، امن و امان کے مسائل، مذہبی و لسانی منافرت، منشیات کا استعمال وغیرہ۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی مسائل تعلیم اور روزگار کے ہیں۔ تعلیم میں طبقات کے سبب دیگر کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر اس مسئلے کو حل کیا جائے تو کئی مسائل خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ مگر بدقسمتی سے سال 15-2014 کے تعلیمی بجٹ پچھلے سال کے مقابلے میں 1.6 فیصد کم ہے یعنی پچھلے سال 14-2013 کے بجٹ میں تعلیم کے لیے 87.8 ارب روپے مختص کیے گئے تھے اور تاہم اس سال 86.4 ارب روپے کا اعلان کیا گیا ہے۔[2] ایک رپورٹ کے مطابق اس رقم کا صرف 5.10 فیصد حصہ وزارت تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ باقی سارا حصہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن (73 فیصد)، کیپیٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈیولپمنٹ ڈویژن (9.38 فیصد)، پاک فوج کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں پر (4.62 فیصد) اور محکمہ برائے بین الاصوبائی رابطہ (0.12 فیصد) کی نذر ہوجاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پاک فوج کے تحت چلنے والے صرف 311 اسکولوں اور 44 کالجوں پر پورے بجٹ کا 4.64 فیصد حصہ خرچ کیا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب پورے ملک کے تمام سرکاری اداروں کے لیے صرف 5.10 فیصد حصہ مختص ہے (فیگر 2)۔ کیا یہ نا انصافی نہیں؟

تعلیم:

بقول نیلسن منڈیلا ''تعلیم ہی وہ طاقتور ترین ہتھیار ہے جس کے ذریعے پوری دنیا کو تبدیل کیا جاسکتا ہے''۔ کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی علم و تعلیم کے بغیر ممکن نہیں اور یہ معاشرے کے ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔ مگر بدقسمتی سے ملک میں اس شعبے کو روز اول سے ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ اپنے قیام کے 66 سال بعد بھی اس ملک میں سالانہ بجٹ کا صرف دو فیصد حصہ شعبہ تعلیم کے لیے مختص ہے جو کہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ دوسری جانب بجٹ کا ایک بڑا حصہ قرض دینے والے سرمایہ دار ادارے جیسے عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ایشین ڈیولپمنٹ بینک کی قرضوں پر سود کی ادائیگی اور اس کے علاوہ دفاع پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کا نظام تعلیم دن بدن بہتر ہونے کے بجائے بدتر اور تنزلی کی طرف سفر کررہا ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی شرح خواندگی 46 فیصد ہے اور بدقسمتی سے اس شرح میں وہ تمام افراد بھی شامل ہیں

فیگر 1

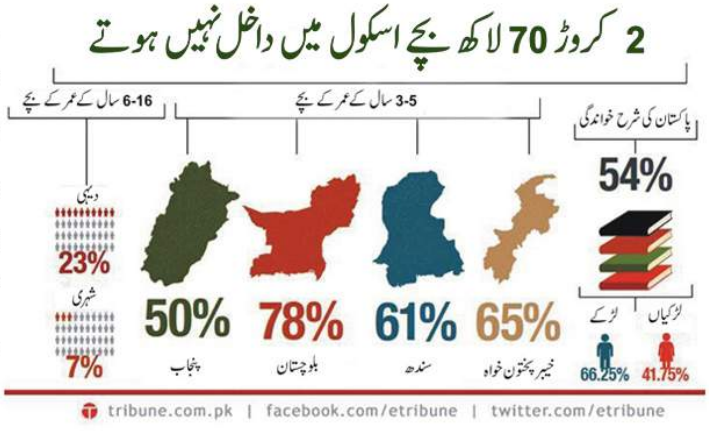

http://www.riazhaq.com/2013/05/facts-and-myths-about- out-of-school.html

فگر 2
تعلیمی بجٹ برائے سال 2014-15

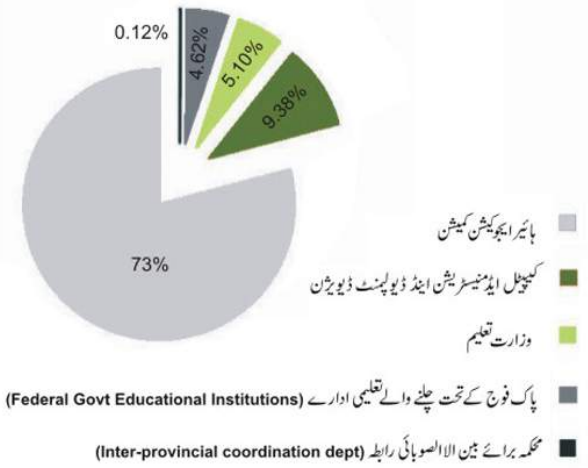

جو فقط اپنا نام لکھنا جانتے ہیں۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق 15 سے 27 سال کے عمر کے 37 فیصد لڑکے اور 63 فیصد لڑکیاں ناخواندہ ہیں اور شرح خواندگی میں شامل افراد میں 33 فیصد لڑکے اور 37 فیصد لڑکیاں صرف پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔ 50 لاکھ بچے اسکول نہیں جاپاتے ہیں۔ جن میں 66 فیصد لڑکیاں ہیں۔ اسکول نہیں جانے والے بچوں کی شرح میں ہم نے بھارت (30 فیصد)، نیپال (22 فیصد) اور بنگلہ دیش (44 فیصد) کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایک حالیہ عالمی سروے کے مطابق پاکستان 120 ملکوں میں اسکول نہ جانے والے بچوں کی درجہ بندی میں نچلی ترین سطح کے دوسرے نمبر پر ہے۔ ان میں آخری نمبر نائجر یا کا ہے۔[3]

دیہی علاقوں میں شرح ناخواندگی خطرناک حد تک اونچی ہے۔ 60 فیصد دیہی علاقوں کی لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند ہیں یعنی وہ کبھی کسی تعلیمی ادارے میں داخل نہیں ہوتیں۔[4] جس کے سبب انھیں زندگی میں لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ملک کی پیداواری نظام میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود بہتر روزگار کے حصول اور خوشحالی میں ناکامی شامل ہے۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے حقوق سے ناواقف ہوتی ہیں گو کہ گھر اور گھر سے باہر بھرپور محنت کرتی ہیں مگر اپنے آپ کو مزدور کی حیثیت تسلیم کروانے سے محروم ہیں۔

نظام تعلیم

ملک کا نظام تعلیم چار مختلف اقسام میں بٹا ہوا ہے اور ہر نظام کا طریقہ تدریس، تدریسی مواد، معلم اور طالب علم کا رویہ نہ صرف ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم بھی نظر آتا ہے۔ ان مختلف اقسام کا انتخاب مختلف طبقات کرتے ہیں۔ مثلاً کسی بیوروکریٹ کی اولاد سرکاری اسکول نہیں جائے گی اور نہ ہی کسی مزدور کا بیٹا بیکن ہاؤس جیسے مہنگے ترین نجی اسکول میں داخلہ لے سکتا ہے۔

سرکاری اسکول:

سرکاری اسکول کا انتظام اور مالی معاملات سرکار کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ پاکستان بیورو آف اسٹیٹیسٹکس کے مطابق ملک میں پرائمری اسکولوں کی تعداد 1,77,724 ہے اور ان میں سے 70 فیصد سرکاری اسکول ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ حکومت کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے کہیں یہ صرف نام کے اسکول، کہیں جاگیردار کا اصطبل اور کہیں منافع خور اسے گودام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

صوبہ بلوچستان میں 85 فیصد اسکول چار یا اس سے کم کمروں پر مشتمل ہیں۔ صرف 20 فیصد اسکول نئی عمارت میں ہیں، 60 فیصد پینے کے پانی سے محروم ہیں اور 60 فیصد اسکول ایسے ہیں جنہیں ایک یا دو اساتذہ چلاتے ہیں۔[5] دیگر صوبوں کی صورت حال بھی زیادہ مختلف نہیں۔

صوبہ بلوچستان میں اسکولوں کی کل تعداد 12,293 ہے۔ ان میں سے 8,092 بغیر چار دیواری کے ہیں۔ 846 بغیر چھت کے اور 9,579 اسکول بجلی کی سہولیات سے محروم ہیں۔ 8,827 ایسے اسکول ہیں جہاں ٹوائلٹ موجود نہیں۔[6]

ایک رپورٹ کے مطابق صرف صوبہ سندھ کے 27 اضلاع میں 6,721 ایسے اسکول ہیں جن کا وجود صرف کاغذوں میں موجود ہے۔[7] ان میں درس و تدریس کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ان اسکولوں کو نہ طالبان نے بند کرایا ہے اور نہ کسی خودکش بمبار نے۔ اس کا مجرم علاقے کا جاگیردار ہے۔ یہ کام وہ بلا خوف، بنا کسی جھجک کے کھلے عام سرانجام دیتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ لوگوں میں علم، شعور اور آگہی پیدا ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر تعلیم باآسانی غریب کے دسترس میں ہوگی تو باشعور ہوگا اور اپنے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کے خلاف ''بغاوت'' کا علم بلند کرے گا۔ پھر زمیندار اپنی وسیع و عریض زمینوں سے منافع کیسے کمائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان اسکولوں کو بند کیا جاتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جرم میں حکومت برابر کی شریک ہے کیونکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے کام خوش اسلوبی سے انجام نہیں دیتے۔ دوسری جانب یہ جاگیردار اتنا با اثر ہوتا ہے کہ علاقے کی پولیس، میڈیا اور دیگر ادارے اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔

یہاں سرکاری اسکول کا انتخاب غریب طبقہ کرتا ہے جو نجی تعلیمی اداروں

کی فیس ادا نہیں کرسکتا۔ یونیسکو کے مطابق اٹھارہ کروڑ کی آبادی والے ملک جس میں نوجوانوں کی تعداد 41.81 ملین ہے میں صرف 1,63,000 سرکاری اسکول ہیں۔ ان میں سے 40,000 برائے خواتین ہیں۔ اگر ہم صوبائی سطح پر دیکھیں تو 15,000 تعلیمی ادارے پنجاب میں 13,000 سندھ میں 8,000 خیبر پختون خواہ اور چار ہزار بلوچستان میں واقع ہیں۔ ملک بھر میں چودہ ہزار لوئر سیکنڈری اسکول میں 54 لاکھ طلباء اور 10 ہزار ہائر سکنڈری اسکولوں میں 30 لاکھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔[8] گلگت بلتستان میں سرکاری تعلیمی اداروں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ مشرف حکومت میں یہاں پہلی قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی بنی۔ یہاں اعلیٰ تعلیم کے ادارے نہ ہونے کے سبب نوجوان ملک کے بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ کالجوں کی سالانہ مردم شماری برائے سال 11-2010 کے مطابق گلگت بلتستان میں کل 20 کالج ہیں۔ 15 لڑکوں کے اور 5 لڑکیوں کے ان میں 4,537 لڑکے اور 2,909 لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ پورے علاقے میں صرف تین ہائر سکنڈری تعلیمی ادارے ہیں۔ پرائمری اور میڈل اسکولوں کی کل تعداد 1,008 ہیں۔ 66 سال گزرنے کے باوجود اس خطے میں حکومت نے کوئی میڈیکل اور انجینئرنگ یونیورسٹی نہیں بنائی اور نہ ہی کوئی فنی تعلیم کا ادارہ موجود ہے۔[9]

بدقسمتی سے سرکاری تعلیمی ادارے کے ساتھ ناروا سلوک ایک عرصے سے جاری ہے کرپشن، اقربا پروری، من پسند کی بھرتیاں، قابلیت (میرٹ) کا قتل عام اور مستحقین کے ساتھ ناانصافیوں کی خبریں عموماً اخباروں کی زینت بنتی ہیں۔ احتساب کا کوئی نظام نہ ہونے کے سبب تنزلی کی طرف سفر جاری ہے۔ جیسے چند ماہ قبل محکمہء تعلیم گلگت بلتستان نے گریڈ 14 کی خالی اسامیوں کو مشتہر کیا۔ اخباری بیانات کے مطابق کھلے عام ایک سیٹ چار سے آٹھ لاکھ روپے میں بکتی رہی اور اس طرح 748 اساتذہ غیر قانونی طور پر بھرتی کیے گئے۔ مقامی اخباروں کے مطابق وہاں کے وزیر تعلیم اس کام میں براہ راست ملوث تھے۔ اس خبر کے اخباروں میں شائع ہونے کے باوجود کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔[10] دوسری مثال صوبہ سندھ کی ہے جہاں پچھلے چند سالوں میں شعبہء تعلیم میں تیس ہزار سے زیادہ غیر قانونی بھرتیاں ہوئی ہیں۔[11]

نجی تعلیمی ادارے

نجی اسکول/کالج کسی ایک فرد یا چند افراد کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔ کسی بھی فرد یا افراد کا کوئی نجی تعلیمی ادارہ کھولنے کا مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آبادی کے ہر طبقے میں اسکول جانے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اس لیے شعبہء تعلیم کو منافع کمانے کا اولیں زریعہ سمجھا جاتا ہے اور آج یہ منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک ادارے قائم کیے جاتے ہیں اور بے انتہا منافع کمارہے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں رجسٹرڈ نجی اسکولوں کی تعداد 36 ہزار ہے۔ ان میں 6.3 ملین طلباء زیر تعلیم ہیں۔[12]

1970 میں ذولفقار علی بھٹو نے اقتدار میں آ کر اسکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا مگر 1977 میں ضیاء الحق کے دور میں یہ ادارے دوبارہ نجی شعبے میں ضم کردیے گئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں نجی تعلیم کو فروغ دینے میں آئی ایم ایف، بین الاقوامی بینک اور یونیسکو (UNESCO) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی برائے سال 2009 کے مطابق ''نجکاری کا کردار (پاکستان میں) پچھلے چند سالوں میں بڑھ رہا ہے۔ گوکہ اس بڑھوتری کی کئی وجوہات ہیں پر سرکاری اسکولوں کا معیاری تعلیم فراہم نہ کرنا بھی اس کی ایک وجہ ہے اور صوبائی حکومتیں استطاعت رکھنے والے طلبہ کے لیے اسکول سطح کی نجی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔''[13] ہمیں شہر میں کئی جگہوں پر بڑی تعداد میں اسکول نظر آتے ہیں۔ جن کے اوپر ''داخلے جاری ہیں'' کا بینر سارا سال لگا رہتا ہے۔ صبح کے اوقات میں اسکول اور شام میں ''کوچنگ سینٹر'' چلائے جاتے ہیں۔ اب دیہاتوں اور گاؤں کی سطح پر بھی دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ قومی تعلیمی مردم شماری 2000 اور 8-2007 کے درمیان ملک میں پرائمری نجی اسکولوں کی تعداد میں 18 فیصد، آٹھویں جماعت تک 98 فیصد اور دسویں جماعت تک کے نجی تعلیمی اداروں میں 105 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان میں نجی تعلیمی اداروں میں پچھلے چودہ سالوں میں 105 فیصد اضافہ ہوا ہے۔[14]

ایک نجی تعلیمی ادارے کے طلباء سے بات چیت کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ان اداروں میں کس طرح مختلف بہانوں سے طالب علموں سے کئی مد میں پیسے حاصل کیے جاتے ہیں۔ داخلے کے وقت ''سیکورٹی فیس'' کے نام پر پیسے لیے جاتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ خارج ہوتے وقت وہ پیسے واپس دے دیے جائیں گے۔ مگر عموماً واپس نہیں ہوتے۔ سہائی امتحانات کی فیس، ششماہی امتحانات کی فیس، پھر ایڈمٹ کارڈ کی الگ فیس، غیر حاضر ہوجانے پر جرمانے کے نام پر فیس اکثر نجی اسکول میں وصول کی جاتی ہے۔ غرض کہ کوئی بھی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جہاں پیسے کمانے کی گنجائش ہو۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ نجی اسکول کاپیوں کی جلدیں اسکول کے نام سے چھاپ کر دوگنی قیمت پر بچوں کو فروخت کرتے ہیں اور انھیں پابند کرتے ہیں کہ تمام طلباء اسکول ہذا سے ہی کاپیاں اور کتابیں خریدیں۔ ان اسکولوں میں درس و تدریس انگریزی زبان میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چند نجی تعلیمی اداروں کے منتظمین اور اساتذہ سے بات چیت کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ان اسکولوں میں درس و تدریس کے لیے عورتیں جن میں سے اکثر نوجوان لڑکیاں ہوتی ہیں، کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ان کی تعلیمی قابلیت کم سے کم

میٹرک اور زیادہ سے زیادہ ایم اے ہوتی ہے۔ میٹرک اور انٹر پاس اساتذہ کو 1,200 سے 3,000 روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ بی اے اور ایم اے ڈگری والے اساتذہ کو 6,000 سے 8,000 روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو بطور ٹیچر بھرتی کرنے میں اسکول مالکان کو فائدہ ہوتا ہے وہ کم تنخواہ پر کام کرنے کو راضی ہوجاتی ہیں اور باآسانی ان سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے۔ ان اسکولوں میں بیشتر اساتذہ کو بغیر ٹیسٹ کے ان کی قابلیت کو بِنا جانچے بھرتی کیا جاتا ہے۔

کیمبرج سسٹم، اے /او لیول

نجی تعلیمی اداروں کے اس قسم میں ملک کے امیر طبقے کی اولاد تعلیم حاصل کرتی ہے۔ یہاں کا نصاب اور تدریسی مواد برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کا ترتیب کردہ ہوتا ہے جسے او/ اے لیول کہا جاتا ہے۔ یہ تعلیمی ادارے عموماً اونچی اور بڑی عمارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور درس و تدریس کا عمل انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ ان کی ماہانہ فیس 10 ہزار سے 30 ہزار تک ہوتی ہے۔

تعلیمی معیار اور تدریسی مواد باقی تمام اقسام سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں روز اول سے ہی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ای سی ڈی (Early Childhood Development) یعنی بچپن کی ابتدائی نشوونما کے لیے تین سے چار سالوں میں چھوٹے بچوں کو کھیل کود اور کھلونوں کے ذریعے بنیادی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔ آٹھویں جماعت سے ہی بچے کو شماریات، جغرافیہ اور بنیادی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ جبکہ یہ مضامین ملک میں رائج دیگر تعلیمی نظام کے دیگر اقسام میں سطحی طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ ان اداروں میں غیر نصابی سرگرمیوں مثلاً کھیل کے مقابلے، تقریری مقابلے، آرٹ کے مقابلے، مباحثے منعقد کرائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اداروں میں طلباء کو سیکھنے کے تمام مواقعے اور سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ان اداروں میں اساتذہ کی خالی نشستوں کو باقاعدہ طور پر ملک کے تمام بڑے اخباروں میں مشتہر کیا جاتا ہے اور مناسب طریقے سے ان کی قابلیت کی جانچ پڑتال کے بعد بھرتی کرتے ہیں۔ انھیں میڈیکل اور آنے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولیات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ ان اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں دیگر تعلیمی نظام میں پڑھانے والے اساتذہ کی تنخواہوں سے تین چار گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ گوکہ ملک میں مسلح افواج کے زیرنگرانی چلنے والے اسکول نجی نہیں ہیں پر ان کا معیار اعلیٰ سطح کے نجی اسکولوں کے قریب قریب پایا جاتا ہے۔

آئی ایف سی (International Finance Corporation) جو عالمی بینک (ورلڈ بینک) کا ممبر ہے نے ملک کے ایک نجی اسکول کی چین بیکن ہاؤس اسکول کو 10 ملین ڈالر فراہم کیے ہیں تاکہ وہ ملک میں مذید 14 اسکول قائم کر سکے۔[15] ان کا ماننا ہے کہ اس منصوبے کے ذریعے پاکستان میں تعلیم کو فروغ دینگے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ سرمایہ درانہ نظام کے تحت چلنے والے ادارے بیکن ہاؤس جیسے نجی تعلیمی اداروں کو کیوں ترجیح دیتے ہیں جو پہلے سے بیش بہا منافع کمارہے ہیں؟

مورخین کے مطابق بیس ویں صدی میں شعبہ تعلیم کو سرکار کے دائرہ کار میں لایا گیا تھا۔[16] اس کی بنیادی وجہ ریاست کی بقاء، تحفظ اور اقدار کے اشتراک کو فروغ دینا ہے۔ اگر اس کو دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ نئی نسل کو ایسے اصول وضوابط سیکھائے جارہے ہیں کہ ریاست چلانے والے اعلیٰ طبقے کے مفاد محفوظ رہیں۔

راقم پچھلے پانچ سالوں میں تین نجی تعلیمی اداروں میں درس و تدریس سے منسلک رہا ہے اور مختلف نجی اسکولوں کے طلباء کو ٹیوشن پڑھاتا رہا ہے۔ اس دوران کئی ایسی سرگرمیاں دیکھنے کو ملیں جو بچوں کو غیر ملکی کمپنیوں کا مستقل صارف بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر سٹی اسکول میں برطانوی کمپنی ہارلیکس (Horlicks) کی ٹیم، آغا خان اسکول میں کولگیٹ (Colgate) (جو کہ امریکی کمپنی ہے) کے افراد وقفے وقفے سے اپنی مصنوعات سمیت آتے ہیں اور اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتے ہیں۔ یہ کمپنیاں کبھی صفائی مہم، کبھی مقابلہ اور آرٹ کے آڑ میں طلبہ کو منڈی میں بکنے والی دیگر اشیاء سے متعارف کراتے ہیں۔ اگر انھیں صفائی کا اتنا ہی خیال ہے تو کچی بستی کے اسکولوں اور سرکاری اسکولوں میں اس نوعیت کے پروگرام کیوں منعقد نہیں کراتے؟ اصولاً ان اداروں کے بچوں میں صفائی کا فقدان پایا جاتا ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان عوامل کا مقصد صفائی نہیں بلکہ بچوں کو کارپوریٹ سیکٹر کی مہنگی اشیاء کا عادی بنانا ہے۔ ایسے تمام کمپنیاں نئی نسل خصوصاً بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے خوبصورت الفاظ اور میڈیا کی مدد لیتے ہیں مثلاً ہارلیکس کے اشتہار میں تین انگریزی الفاظ شارپر (Sharper)، اسٹرانگر (Stronger)، ٹالر (Taller) سے یہ یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ اس کو استعمال کرنے والے تیز، طاقت ور اور طویل قامت ہوتے ہیں۔ نجی تعلیمی ادارے کے طلباء و اساتذہ مختلف تقریبات مثلاً سالگرہ وغیرہ کے ایف سی (KFC) اور پیزا ہٹ (Pizza Hut) جیسے مہنگے غیر ملکی ریسٹوران میں کرتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ والدین بھی اپنے اسٹیٹس یعنی طبقے کو اجاگر کرنے کے لیے بچوں کی سالگرہ ان غیر ملکی ریسٹوران میں مناتے ہیں۔ تشویش ناک امر یہ ہے کہ یہ کمپنیاں اسکولوں کے مالکان اور انتظامیہ سے گٹھ جوڑ کے ذریعے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا بچوں کو اقدار اور صفائی کے متعلق سکھانا اساتذہ اور اسکول کی ذمہ داری نہیں؟ ان نجی تعلیمی اداروں کے لیے احتساب کا عمل ہونا چاہئے تاکہ سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں سے نئی نسل اور عوام کو بچایا جاسکے۔

مدارس

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہبی سوچ کے حامل والدین اپنی اولاد کو مدارس میں داخل کراتے ہیں۔ مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس کے پیچھے کئی اور وجوہات بھی شامل ہیں مثلاً کتابیں، بستہ اور پنسل وغیرہ کے لیے زیادہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ ہمارے ارد گرد کئی ایسے مذہبی رجحان رکھنے والے افراد بستے ہیں جن کے بچے انگریزی میڈیم اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ طارق رحمان کے مطابق 1947 میں ملک میں صرف 137 مدارس تھے اور اپریل 2002 تک ان کی تعداد 10,000 تک پہنچ گئی ہے جن میں 1.7 ملین طلباء رہائش پزیر ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔[17]

یہ سوچ بھی عام ہے کہ مدارس میں بچوں کو مفت خوراک، لباس اور رہن سہن کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ملک کا وہ انتہائی غریب طبقہ جو اپنی اولاد کو ملک میں موجود دیگر تعلیمی نظام کے اقسام میں داخل نہیں کراسکتا، دو وقت کی روٹی نہیں کھلا سکتا اور ان کا تن نہیں ڈھانپ سکتا تو مدارس میں داخل کروا دیتا ہے۔ مدارس میں بچوں کے ساتھ تشدد کی خبریں متعدد بار میڈیا میں آچکی ہیں۔ کیونکہ بیشتر مدارس کے اساتذہ خود تعلیم و تربیت سے آراستہ نہیں ہوتے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ کی مدد سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدارس کے قاری کے رویے اور جسمانی وجنسی طور پر ہراساں کرنے کی خبریں بھی بارہا آچکی ہیں۔[18,19] کراچی میں تین سال قبل اس نوعیت کے ایک واقعے میں قاری نے سات سالہ بچے کی ٹانگ توڑ دی تھی۔[20] اسی طرح کے ایک اور واقعے میں ملتان میں مدرسے کے استاد نے سات سالہ بچے کا سر ڈنڈے سے مار کر پھاڑ دیا تھا۔[21] ایسے واقعات کے رونما ہونے کے باوجود ملک میں مدرسہ جانے والوں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

اس وقت پاکستان میں مدارس کے پانچ بورڈ ہیں سب سے بڑے بورڈ وفاق المدارس العربیہ کے ساتھ نو ہزار مدارس وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ تنظیم المدارس اہلسنت، وفاق المدارس السّلفیہ، وفاق المدارس شیعہ اور جماعت اسلامی کے رابطہ المدارس الاسلامیہ کے ساتھ 13,000 سے زائد مدارس وابستہ ہیں جن میں 30 لاکھ سے زائد طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔[22]

پاکستان میں مدارس کے سب سے بڑے بورڈ وفاق المدارس کے نصاب میں باقاعدہ اردو، انگریزی، ریاضی اور سائنس شامل ہے۔[23] یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ مگر اسی بورڈ کے تحت چلنے والے مدرسوں، جو کراچی سے گلگت، چترال تک پھیلے ہوئے ہیں، میں لڑکیوں کو انگریزی، ریاضی اور سائنس کے مضامین نہیں پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک ہی جماعت کے لڑکوں کے لیے الگ اور لڑکیوں کے لیے الگ نصاب ترتیب دیا ہوا ہے۔ لڑکیوں کو قرآن، قصص الانبیا، کتاب النکاح اور بہشتی زیور پڑھایا جاتا ہے۔[24]

پاکستان میں خصوصاً بلوچستان اور کے پی کے کے چند علاقوں میں لڑکیوں کو اس جواز کے ساتھ اسکول نہیں بھیجا جاتا ہے کہ ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب نہیں جو علم و تعلیم کی اجازت نہیں دیتا ہو۔ حدیث مبارکہ ہے کہ ''علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے''۔ اس حدیث میں صرف مردوں کو علم کی تلاش میں چین جانے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس قسم کے خیالات نے بچوں اور نوجوان لڑکیوں کے لیے تعلیم تک رسائی بہت مشکل بنادی ہے۔

طبقاتی نظام کے حقائق

ہمارے ملک میں کئی قسم کے نظام تعلیم رائج کے پیچھے کئی پوشیدہ محرکات میں سے ایک سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ اوران کی اولاد ہمیشہ حکمران رہنے کا خواب اسی طبقاتی نظام تعلیم کا مرہون منت دیکھتا ہے۔ شعبہ تعلیم کے یہ درجات اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اس سے حکمران طبقہ فائدہ اٹھاتا چلا آرہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیکن ہاؤس جیسے نجی اسکول، سرکاری اسکول اور مدرسہ سے فارغ التحصیل طلباء عملی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کا مضمون تینوں نظاموں سے فارغ التحصیل طلباء پڑھ کر آتے ہیں مگر تدریسی مواد اور معلمین کے مختلف نقطہ نظر کی وجہ سے تین الگ الگ علامہ اقبال کے تصورات سامنے آتے ہیں۔ اس بارے میں ماہر تعلیم روبینہ سہگل کہتی ہیں:

''بعض مدارس کے طلباء میں عسکریت پسند رویہ بہت زیادہ فروغ پزیر ہے اسی طرح سرکاری اسکولوں کے طلباء میں یہ تناسب بہت زیادہ ہے لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ نجی تعلیمی اداروں کے طلباء طالبات میں تعصّبات نہیں ہیں۔ ریاست اور مدارس کے نصاب میں ایک دلچسپ فرق ہے۔ ریاستی نصاب بہت زیادہ بھارت کے مخالف ہے کیونکہ اسے پاکستان کے تحفظ کے تناظر میں ترتیب دیا گیا ہے۔ لیکن مدارس کا نصاب ہندوؤں کے بہت زیادہ خلاف نہیں بلکہ یہ مغرب مخالف زیادہ ہے اور مغربی اقدار کی نفی کرتا ہے۔''[25]

اس وجہ سے تفریق اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کی اولاد اس نظام تعلیم کی وجہ سے بیوروکریٹ، متوسط طبقے کے بچے کلرک جیسی کم اجرت والے روزگار نوکری اور مزدور کی اولاد مزدوری کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کارل مارکس نے کہا تھا:

''حکمران طبقوں کے نظریات ہر دور میں حکمران نظریات رہے ہیں۔
جو طبقہ مادی ذرائع پیداوار پر حاوی ہوتا ہے اس طبقے کے نظریات بھی

باقی نظریات پر حاوی ہوتے ہیں۔ جس طبقے کے قبضے میں ذرائع پیداوار ہوتے ہیں، اسی طبقے کے قبضے میں وہ ذرائع بھی ہوتے ہیں جو خیالات اور نظریات کی پیداوار کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لہذا جن لوگوں کے پاس خیالات کے ذرائع پیداوار نہیں ہوتے وہ ان خیالات سے متاثر ہوتے ہیں جو حکمران طبقے تیار کرتے ہیں۔ وہ نظریات جو معاشرے میں غالب ہوتے ہیں معاشرے کے سماجی اور مادی رشتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ مادی اور معاشی رشتے ہی خیالات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سماجی رشتوں میں کچھ طبقے دوسروں پر حاوی ہوتے ہیں لہذا حاکم خیالات اس عدم برابری کے ہی خیالات ہوتے ہیں۔ حکمران طبقوں کے پاس سوچ کے ذرائع اور ایک خاص شعور ہوتا ہے۔ لہذا وہ اس شعور کے تحت سوچتے ہیں۔ ان طبقوں کا کسی بھی دور کی ہر چیز پر غلبہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور حکمرانی کو نظریات کے ذریعے بھی فروغ دیتے ہیں۔ وہ سوچ کے ذریعے بھی حکومت کرتے ہیں۔ وہ خیالات بنانے والوں کے طور پر اور دانشوروں کے طور پر بھی حاکم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے اور اپنے مفاد کے نظریات کی ساخت بھی کرتے ہیں اور ان نظریات کو معاشرے میں پھیلانے کے ذرائع پر بھی قابض ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے نظریات ہی حکمراں نظریات بن جاتے ہیں۔''[26]

دوسری جانب مزدور اور غریب طبقے کے نوجوانوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اول تو اس طبقے کو اپنے حقوق اور آزادی رائے سے واقف ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا کیونکہ اس طبقے کو علم و آگاہی سے دور رکھنا حکمراں طبقے کے مفاد میں ہوتا ہے۔ اس سے ان کے مظالم کی پردہ پوشی بھی ہوتی ہے اور مذاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ مزدور اور غریب طبقے کا وجود محض امراء اور حکمراں طبقے کی خدمت کرنا ہے۔ معاشرے میں حکمران نظریات کو نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے حاوی کیا جاتا ہے۔ ان نظریات کو معاشرے میں اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ تمام لوگ اسے حقیقت اور اپنا نظریہ تسلیم کرتے ہیں۔ اتنا ظلم سہتے ہیں کہ ظلم سہنے کو اپنی قسمت مانتے ہیں۔

پاکستان کے قانون نافذ کرنے والے اداروں اور حکمرانوں نے اس نظام کو تناور درخت بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر روبینہ اس بارے میں کہتی ہیں کہ پاکستان میں چاہے کوئی بھی نظریہ حاوی رہا ہو اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل میں مدد دی ہے۔ فوج نے اس نظام کو تحفظ بھی دیا ہے اور سرپرستی بھی کی اور نظریے کو اس نظام کے لیے اچھے کارکن اور فوج کے لیے اچھے سپاہی فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا۔[27]

ایک طرف حکمران طبقہ سوچوں پر قبضہ کرتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام ہر مرحلہ پر اپنے تقاضے بدلتا ہے اور ہر مرحلے پر تعلیمی نظام سے توقع ہوتی ہے کہ زیادہ پیداوار کرنے والا مزدور فراہم کیا جائے۔ جدیدیت اور جمہوری دور سے تبدیلیاں ضرور آتی ہیں لیکن اس بات کے بے شمار دلائل ملتے ہیں کہ تعلیم کا سرمایہ داری معیشت سے گہرا رشتہ ہے۔ تعلیم پیداواری طبقے کی شناخت کے لیے اہم ہے کیونکہ یہ ''اچھی'' قدریں فراہم کر سکتی ہے بلکہ نئی نئی قسم کے ہنر اور علوم عام کر سکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے استحصالی پیداواری رشتوں کی ازسرنو تشکیل کی جاتی ہے۔ مشہور تاریخ داں ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب تاریخ اور نصابی کتب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''حکمران چاہے کسی بھی ملک کے ہوں، وہ نصاب کی کتابوں کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا نظریہ اور نقطہء نظر طالب علموں کے ذہنوں میں بٹھا دیا جائے۔ لہٰذا ان کتابوں میں جن پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ طالب علموں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ سچائی کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ پرامید ہو، ناکامیوں کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ ان سے اخلاقی اسباق حاصل ہوں اور طالب علم نا امید یا مایوس نہ ہو۔ مگر جہاں کامیابیاں ہوں ان کو تفصیل سے پیش کیا جائے۔ جب بھی ریاست کا ذکر ہو تو اس کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ طالب علموں میں اس سے وفاداری کے جذبات پیدا ہوں اور ریاست کو اپنا محافظ و نگراں سمجھیں۔ نصاب کو جب اس انداز اور اسلوب سے لکھا جاتا ہے تو اس کے طالب علموں میں تنقیدی سوچ اور تجزیاتی انداز پیدا نہیں ہوتا ہے۔ وہ واقعات کو سیدھے سادھے انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان میں تنقیدی انداز میں دیکھنے اور پرکھنے کا شعور نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے تبدیلی کی خواہش پیدا نہیں ہوتی اور معاشرے کا ہر طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کا تعین تاریخی طور پر ہو چکا۔''[28]

ملک میں رائج اس طبقاتی نظام کے تحت مہنگے نجی تعلیمی اداروں سے نکلا نوجوان ملک کے وسائل پر قبضہ جماتا ہے اور وسائل کو ایک مخصوص دائرے میں صرف اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مخصوص طبقہ انتظامی امور پر قابض ہوتا ہے جبکہ مزدور طبقے کے نوجوان چونکہ ایک ایسے نظام تعلیم سے نکل کر آتے ہیں کہ اپنے اوپر قابض طبقے کا میدانِ تعلیم اور سرکاری و نجی اداروں میں اعلیٰ عہدوں کے لیے مقابلہ نہیں کر سکتے اس طرح غربت اور بے کسی کے عالم میں اپنے والدین کی طرح پستے ہیں۔

پاکستان میں طبقاتی نظام تعلیم کو مضبوط کرنے کے لیے سرکاری تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلباء کس درجے کی ''معیاری تعلیم'' حاصل کرتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل کو پڑھ کر کیا جاسکتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صوبہ سندھ میں پرائمری سطح پر 33 فیصد بچے ایک جملہ پڑھ سکتے ہیں۔ صرف 27 فیصد مقامی یا اردو زبان میں پچھلی جماعتوں کے نصاب میں موجود کہانی پڑھ سکتے ہیں۔ 27 فیصد ایک سو سے چھوٹے اعداد کی حساب کتاب کر سکتے ہیں اور صرف 13 فیصد تین عددی تقسیم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

بلوچستان میں اسکول جانے والوں میں 92.2 فیصد بچے اپنے سے ایک جماعت کم جو نصاب ایک سال قبل پڑھ چکے ہیں میں موجود کہانی نہیں پڑھ سکتے ہیں اور 78 فیصد پچھلی جماعت کی درسی کتب کے جملے نہیں پڑھ سکتے۔

ظاہر ہے اس درجے کی تعلیم حاصل کرتے کے بعد ان کی حالت مزید کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں انتظامی اور وسائل پر قابض طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ معاشرتی، معاشی اور ذہنی طور پر خود کو مزید کمزور سمجھتے ہیں۔ یوں یہ طبقہ محنت مزدوری اور خدمت میں لگ جاتا ہے۔ یہاں سے کئی دیگر مسائل مثلاً بے روزگاری، احساس کمتری اس طبقے کے نوجوانوں کے سامنے آتے ہیں۔

اب غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ایک طرف مزدور کی سوچ پر قبضہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ قانونی کھیل بھی کھیلا جاتا ہے۔ پاکستان کے آئین کے شق نمبر 25 کے مطابق 5 سے 16 سال کی عمر کے تمام بچوں کو ابتدائی اور بنیادی تعلیم فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔[29] مگر پاکستانی حکومت اور حکمران پچھلے 66 سالوں سے آئین کے شق نمبر 25، 37A اور 38 کی شعوری طور پر خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 38 کے مطابق عام آدمی کے معیار زندگی کو بلند کر کے دولت اور وسائل، پیداوار و تقسیم کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں اس طرح جمع ہونے سے روک کر کہ اس سے مفاد نقصان پہنچے اور اجرو ماجور اور زمیندار و مزارع کے درمیان حقوق کی منصفانہ تقسیم کی ضمانت دے کر بلا لحاظ جنس و ذات، مذہب یا نسل عوام کی فلاح و بہبود کی حصول کی کوشش کرے گی۔

(ب) تمام شہریوں کے لیے ملک میں دستیاب وسائل کے اندر معقول آرام و فرصت کے ساتھ کام اور مناسب روزی کی سہولتیں مہیا کرے گی۔

کیا یہ کھلا تضاد اور آئین کا انحراف نہیں کہ آئین بنانے والے اور رکھوالے ہی اس پر کوئی عمل نہیں کرتے۔ اب ایک ایسا نظام تعلیم ناگزیر ہے جس میں ہر فرد کو یکساں مواقع فراہم ہوں۔

معروف انقلابی رہنما چی گویرا نے ایک مرتبہ اپنے گوریلا فائٹرز سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر تم چاہتے ہو کہ وہ (ارباب اختیار) تمہیں دھوکہ نہ دے سکیں تو لکھنا پڑھنا سیکھو۔ کیونکہ جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو اسے آسانی سے دھوکہ نہیں دیا جاسکتا'' ہمارے ارباب اختیار سختی سے اس بات پر عمل پیرا ہے کہ غریب طبقہ علم و تعلیم سے دور رہے۔ اس مقصد کے لیے نظام تعلیم کا سہارا لیتے ہیں۔ تعلیم تمام مسائل کا حل ہے مگر بدقسمتی سے ہمارا نظامِ تعلیم مزید مسائل پیدا کرتا ہے۔

حوالہ جات

1. Government of Pakistan. Ministry of Youth Affairs, "National Youth Policy." December, 2008. Accessed from http://www.moya.gov.pk/national_youth_policy.html

2۔ ''وعدوں کے باوجود تعلیمی بجٹ میں کمی،'' ڈان اردو، 5 جون 2014 ۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا ہے:
http://urdu.dawn.com/news/1005552/education-budget-decreased-despite-promises.

3۔ سبزواری، محمد احمد۔ ''تعلیم اور بجٹ،'' جنگ، 13 جولائی 2013 ۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا ہے: http://www.pkdebate.com/2013/07/13/taleem-aur-budget-by-muhammad-ahmed-sabzwari-dated-13-july-2013/

4۔ ایضاً۔

5. "For many children of Baluchistan, attending school is not an option." Express Tribune, 10 Feb, 2013. Accessed from http://tribune.com.pk/story/135092/educating-girls-every-third-child-in-sindh-is-out-of-school

6. Haq, Riazul. "Over 27 million children out of school," Express Tribune, 18 May, 2013. Accessed from http://tribune.com.pk/story/505189/for-many-children-of-balochistan-attending-school-is-not-an-option/

7. "Ghost Schools are failing Pakistan," The Nation, 21 December, 2013. Accessed from http://www.thenational.ae/thenationalconversation/editorial/ghost-schools-are-failing-pakistans-potential#ixzz2yZE7mdR6

8. Lynd. D. "Ghost schools are failing Pakistan: Assessment of the National Education Census." UNESCO, Islamabad, 2007. Accessed from http://unesco.org.pk/education/teachereducation/files/sa4.pdf

9. Government of Gilgit Baltistan. "Annual Education Census 2010-11, Education Department." Accessed from Annual Education Census 2010-11, Education Department, Government of GB, 2012.

10۔ کرپشن، ن لیگ کے دعوے کہاں گئے ''بروشال ٹائمز،'' 17 اپریل 2014 ۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے لیا گیا ہے:
http://brooshaaltimes.com/کرپشن،-ن-لیگ-کے-دعوے-کہاں-گئے؟/

11۔ بختیار، ادریس۔ ''تعلیم چاہیے،'' جنگ، 6 جولائی 2014۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے لیا گیا ہے:
http://e.jang.com.pk/06-05-2014/karachi/pic.asp?picname=06_03.gif

12. Ashraf, Muhammad and Kopew, Peter. "Globalization and Education Policy of Pakistan: the challenges of access and equity in education." College of Social Sciences, School of Education, University of Glasgow, UK, Accessed from http://www.periglobal.org/sites/periglobal.org/files/9.Globalisation&Education_Policy_Pakistan(Ashraf).pdf

13۔ ایضاً
14. Government of Pakistan. "Pakistan Education Statistics 2011-12." Accessed from http://unesco.org.pk/education/documents/2013/pslm/Pakistan_Education_Statistics.pd
15. Joseph, L. "IFC invests US$ 10 million in Pakistan's Education System." Accessed from http://ifcext.ifc.org/IFCExt/pressroom/IFCPressRoom.nsf/0/BA4E72DDF78AC1E0852569700074B608
16. Sosale, Shabhana. "Trends in private sector development in World Bank Education Projects." Accessed from http://books.google.com.pk/books?id=3wW_9L6PhMYC&pg=PA19&lpg=PA19&dq=ifc+beacon+house&source=bl&ots=peOq9AvnN1&sig=Ung8WmuvZCfbAjITinN0rolUrn8&hl=en&sa=X&ei=6IuyU4S5Ncub0AWH64CIBA&ved=0CEsQ6AEwCQ#v=onepage&q=ifc%20beacon%20house&f=false
17. Rehman, Tariq. "Understanding Pakistan 2: Education in Pakistan, a survey." Second Impression, April, 2003.
18. Mehmood, Arshad. "Sexual violence featured." View Point, 13 Oct, 3013. Accessed from http://viewpointonline.net/2014/03/sexual-violence/3386-sexual-violence
19. Ali, Manzoor. "Child rape: Three-years-old assaulted by Madrassa teacher." Express Tribune, 22 May, 2011. Accessed from http://tribune.com.pk/story/173622/child-rape-three-year-old-assaulted-by-madrassa-teacher/
20. Muhammad, Zehra Peer. "Maulvi break a leg-literally." Express Tribune, 23 Aug, 2011. Accessed from http://blogs.tribune.com.pk/story/7600/maulvi-breaks-a-leg-literally/
21. Muneer, Hafiz Shahid. "Madarrasa teacher flees after torturing 2 students for four months." Express Tribune, 4 August, 2011. Accessed from http://tribune.com.pk/story/223768/madrassa-teacher-flees-after-torturing-2-students-for-four-months/
22۔ میر، حامد۔ ''تصویر کا دوسرا رخ؛'' جنگ، 18 جولائی 2011 ۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے لیا گیا ہے: http://www.awaztoday.com/singlecolumn/247/Hamid-Mir/Bright-side-of-Madaris-education-system-in-Pakistan.aspx
23۔ وفاق المدارس۔ ''نصاب تعلیم مرحلہ ثانویہ عام بنین (میٹرک)۔'' مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے لیا گیا ہے: http://www.wifaqulmadaris.org/downloads/N_M05.pdf
24۔ وفاق المدارس۔ ''نیا نصاب تعلیم عامہ و خاصہ بنات برائے سال 1435 ہجری۔'' مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے لیا گیا ہے: http://www.wifaqulmadaris.org/downloads/N_F5&6.pdf
25۔ سہگل، روبینہ۔ ''قومیت، تعلیم اور شناخت۔'' فکشن ہاؤس، صفحہ نمبر 101۔
26۔ سہگل، روبینہ۔ ''قومیت، تعلیم اور شناخت۔'' صفحہ نمبر 102۔
27۔ سہگل، روبینہ۔ ''قومیت، تعلیم اور شناخت۔'' صفحہ نمبر 146۔
28۔ علی، مبارک۔ ''تاریخ اور نصابی کتب۔'' فکشن ہاؤس، صفحہ نمبر 76۔
29. Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973. "Article: 25 Equality of Citizens." Accessed from http://pakistanconstitutionlaw.com/article-25-equality-of-citizens/

بات تو سچ ہے مگر

کسانوں کو معیاری بیج کی فراہمی کے لیے قانون سازی

لاہور میں ایگریکلچر جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہونے والے سیمنار ''ایمپلا ئنگ ماڈرن ٹیکنالوجیز ان ایگریکلچر سیکٹر'' (زرعی شعبے میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال) سے خطاب کرتے ہوئے سید محمد ناصر علی، ڈائریکٹر جنرل سیڈ سرٹیفیکیشن اینڈ رجسٹریشن کا کہنا تھا کہ بیج کے قانون کی منظوری کسانوں کے لیے معیاری بیج کی فراہمی کے لیے اہم ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ جینیاتی طور سے تبدیل شدہ بیجوں کو قانونی تحفظ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں رائج نہیں کیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے زور دے کر کہا کہ فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے لیے جدید ٹیکنالوجیوں کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے۔ خوراک کی بڑھتی ہوئی مانگ اور ہمارے محدود وسائل کی وجہ سے خوراک پیدا کرنے کے لیے پاکستان کو بہتر طریقوں کو اپنانے کی ضرورت ہے، جن میں سے ایک جینیاتی ٹیکنالوجی ہے۔ سینئر ممبر فارمرز ایسوسی ایشن آف پاکستان ڈاکٹر ظفر حیات نے کپاس کی غیر معیاری بیج اور ان سے متعلق مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے پاس فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کی وسیع صلاحیت موجود ہے لیکن قواعد وضوابط کے بغیر چلنے والے بیج کے کارخانوں کی وجہ سے کسان اصل تصدیق شدہ بیج حاصل نہیں کر پاتے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ کپاس کی فی ایکڑ پیداوار بڑھائے جانے کے بہت اچھے امکانات ہیں لیکن اس کے لیے بیج سے متعلق جتنے مسائل ہیں ان پر سخت قانون بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ کسانوں کو بی ٹی کپاس کی فراہمی یقینی بنائیں۔

(دی نیوز، 14 جنوری، 2014، صفحہ 15)

25 زرعی ماہرین تربیت کے لیے آسٹریلیا روانہ

آسٹریلوی ہائی کمیشن کی ایک پریس ریلیز کے مطابق آسٹریلیا، پاکستان ایگری کلچر اسکالرشپ (Australia Pakistan Agricultural Scholarships/APAS) کے تحت شارٹ کورس ایوارڈ پروگرام کے لیے 25 پاکستانی زرعی ماہرین کو اسکالرشپ دی گئی ہے۔ اسکالرشپ حاصل کردہ افراد یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں آبپاشی اور واٹر منیجمنٹ (پانی کے وسائل کا انتظام) کے علاوہ دیگر زرعی تعلیم حاصل کریں گے۔ سال 14-2013 میں آسٹریلیا پاکستان کو 76 ملین آسٹریلوی ڈالرز (سات بلین روپے) کی ترقیاتی امداد دے گا جو کہ صحت، تعلیم، گورننس، تجارت اور زراعت کے لیے مختص کی گئی ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبون، 28 جنوری، 2014، صفحہ 4)

زراعت کے شعبے میں پاک بھارت تعاون بڑھانا

کینیڈین ہائی کمشنر گریگ جیوکاس (Greg Giokas) نے کہا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان زراعت کے شعبے میں تعاون سے انقلاب آسکتا ہے۔ اس شعبے میں تعاون سے دونوں ممالک کے تعلقات میں بہتری کے ساتھ ساتھ غربت مٹانے کے بھی امکانات ہیں۔ دونوں ملک آپس میں تجارت کے حوالے سے ایک نیا خطہ بنا سکتے ہیں اگر وہ اپنے تجارتی اور سفارتی رشتے استوار کرلیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پاکستان اور بھارت کو اپنی زرعی اشیاء پر توجہ دیتے ہوئے جدید ٹیکنالوجی کو بھی اپنانا چاہیے۔ اس موقع پر کورنگی ایسوسی ایشن آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری (KATI) کے صدر میاں زاہد احمد کا کہنا تھا کہ زرعی تجارت قیمتوں میں استحکام اور خوراک کے تحفظ میں بھی ایک اہم کردار کھیل سکتی ہے۔

(دی نیوز، 4 فروری، 2014، صفحہ 17)

پیداوار بڑھانے کے لیے کسانوں کی ٹنل ٹیکنالوجی کی طرف توجہ

زرعی ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک میں کسان ٹنل (Tunnel) ٹیکنالوجی کو تیزی سے اپنانے لگے ہیں۔ جو کہ روایتی طریقہ کاشت کاری کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ منافع اور پیداوار دیتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے علاقائی آبادیوں کے لیے بہتر روزگار کے ساتھ ساتھ ملک میں غذائی تحفظ ممکن بنانے میں بھی مدد ملے گی۔ ایک ماہر کے مطابق پاکستان میں کولڈ اسٹورج کی کمی، پیداواری لاگت میں اضافہ اور فرسودہ زرعی ڈھانچے نے کسانوں کے منافع کو کم کر دیا ہے۔ اب وہ ٹنل فارمنگ کے ذریعے مطلوبہ درجہ حرارت سے غیر موسمی فصل اگا کر اچھی رقم حاصل کر رہے ہیں۔ ٹنل فارمنگ کے ذریعے کاشتکار ہائبریڈ بیج، کیڑے مار مواد، مناسب کھاد اور آبپاشی استعمال کرکے فی ایکڑ زیادہ پیداوار اٹھا سکتا ہے۔ اس طریقہ پیداوار میں پودے کو متواتر غذائی اجزاء ملتے رہتے ہیں اور معیاری اشیاء حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نئی زرعی طریقے کی بدولت بھارت سے سبزیوں کی مانگ میں کمی آئی ہے۔ ایک ٹنل فارمر آصف وڑائچ کا کہنا تھا کہ گوبی، تربوز، اسٹرابیری اور ککڑی کی ضرورت ٹنل فارمنگ کے ذریعے چاروں موسموں میں پوری کی جاتی ہے۔ ان کا

مزید کہنا تھا کہ ٹنل ٹیکنالوجی نے زراعت کے شعبے میں بنیادی تبدیلیاں لانے کا راستہ صاف کردیا ہے۔ اس کے ذریعے کسان غیر موسمی فصل پیدا کرکے اپنی مالی حالت بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔ جب کہ روایتی طریقہ سے ہم پیداواری لاگت تک پوری نہیں کر سکتے تھے۔

وڑائچ نے بتایا کہ پاکستان میں تین قسم کی ٹنل فارمنگ ہو رہی ہے۔ لوٹنلز، واک ان ٹنلز اور ہائی ٹنلز۔

لوٹنل، ہائی ٹنل سے سستا ہے۔ اس کی لاگت 30,000 روپے فی ایکڑ ہے۔ زمین کی تیاری، اسپرے اور چنائی اس قسم کے ٹنل میں مشکل ہوتی ہے لیکن چھوٹے کسان زیادہ تر لوٹنلز کو استعمال کرتے ہیں۔ واک ان ٹنلز، لوٹنلز کے مقابلے میں اچھی فصل دیتے ہیں لیکن اس کے بنیادی ڈھانچے کی قیمت 120,000 روپے فی ایکڑ ہے۔ ہائی ٹنلز سب سے زیادہ فصل دیتے ہیں۔ زمین کی تیاری، اسپرے اور چنائی بھی اس کے لمبائی اور چوڑائی کی وجہ سے آسان ہے۔ اس کے بنیادی ڈھانچے کا خرچہ 600,000 روپیہ فی ایکڑ ہے۔ زیادہ تر زمیندار ایسے ٹنلز میں سرمایہ کاری کررہے ہیں۔ کسانوں کا کہنا تھا کہ وہ غیر موسمی سبزیوں کی کاشتکاری اور ٹنل پر لگائے جانے والے سرمائے پر اچھے منافع سے خوش ہیں۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 13 فروری، 2014، صفحہ 11)

کارپوریٹ فارمنگ کی طرف پیش قدمی

سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان نے 19 کمپنیوں کا کارپوریٹ فارمنگ کے لیے اندراج کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر بیج، پولٹری اور مرغیوں کی خوراک کے کاروبار سے تعلق رکھتی ہیں۔ آفاق تیوانا، جن کا 2000 کی دھائی کے شروع میں ملکی و غیر ملکی کارپوریٹ زراعت میں سرمایہ کاری کے لیے پالیسی بنانے والوں میں ایک کلیدی کردار تھا کا کہنا ہے کہ بڑے کاروباری گروہ کارپوریٹ فارمنگ میں سرمایہ کاری کررہے ہیں۔ ڈیری فارمنگ اور حلال گوشت میں کئی کارپوریشنوں نے اس پالیسی کے اعلان کے بعد سے سرمایہ کاری کی ہے اور امید ہے جلد کئی سبزیوں کے شعبے بھی سرمایہ کاری کریں گے۔ کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس بنانے کا مقصد تھا کہ بڑے پیمانے پر مراعات (incentives) کی فراہمی سے بیرونی اور مقامی کمپنیوں کو زرعی سرمایہ کاری کی طرف مائل کیا جاسکے۔ سرمایہ کاری کرنے والے کچھ خلیجی ممالک مثلاً سعودی عرب اور یو اے ای سے امید لگائی جارہی تھی کہ وہ سرکاری یا نجی بڑے پیمانے پر بنجر اور غیر کاشت زمین لیز یا قیمت پر لے کر کاشتکاری کریں گے اور سرمایہ کاری کرکے کھانے کی فصل کی پیداوار اپنے ملکوں میں درآمد کریں گے۔ منصوبہ بندی اس طرح کامیاب نہیں ہو پائی جس طرح سوچا گیا تھا۔ اس قانون کے تحت سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے کئی مراعات فراہم کی گئی ہیں۔ زراعت کو صنعت قرار دیتے ہوئے کارپوریٹ شعبے کو کارپوریٹ فارمنگ کے لیے بڑے قرضوں کی فراہمی کے ساتھ ٹیکس کی چھوٹ اور دیگر مالیاتی آسانیاں جیسے مشینری پر درآمدی ٹیکس کی معافی اور لا تعداد زمین رکھنے کی اجازت ہے۔ کئی اہم مقامی سرمایہ کار جیسے میاں محمد منشا اور جہانگیر ترین نے اس شعبے میں سرمایہ کاری کی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار زمین کا بڑا رقبہ مانگتے ہیں جو کہ نجی کھیت کے مالکوں سے لینا مشکل ہے اور حکومت دینے کو تیار نہیں۔ کارپوریٹ زراعت کے بڑے فوائد ہیں مثلاً جدید ٹیکنالوجی کے منتقلی اور پیداوار بڑھانا، مداخل کی قیمت کم کرنا اور غذائی تحفظ کو بہتر بنانا۔ اس کے علاوہ زیر کاشت زمین کو ٹکڑوں میں بٹنے سے روکنا اور زرعی پیداوار، پروسسنگ اور مارکیٹنگ میں ضروری رابطے پیدا کرکے صنعتی ترقی کو ممکن بنانا شامل ہیں۔

(ڈان، 17 فروری، 2014، صفحہ 1)

واہگہ باڈر پر کسانوں کا دھرنا

خالد محمود کھوکھر پاکستان کسان اتحاد کے مرکزی صدر کے مطابق بھارت کو منڈی میں غیر امتیازی رسائی (Non-Discriminatory Market Access/NDMA) دیتے ہوئے آزاد تجارت کے فروغ پر پاکستان کسان اتحاد 31 مارچ کو واہگہ بارڈر پر دھرنا دے گا۔ جس میں تقریباً ایک ملین لوگ شامل ہوں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ زرعی شعبے میں پاکستان قیمت کے معاملے میں بھارت سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اگر بھارت کے ساتھ آزاد تجارت کو اپنا لیا گیا اور سستی زرعی مصنوعات کی درآمد شروع ہوتی ہے تو یہ پاکستانی کسانوں کے موت کی مترادف ہوگی۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ تجارت کو محدود اشیاء کے ساتھ شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ مزید یہ کہ ان دونوں ملکوں کی پیداواری قیمت میں بے تحاشا فرق پایا جاتا ہے۔ زرعی اشیاء کی پیداواری قیمت پاکستان میں بھارت سے چار سے پانچ گنا مہنگی ہے حالانکہ دونوں ملکوں کی زرعی زمین ایک جیسی ہے۔ مثلاً پاکستان میں یوریا 50 کلوگرام 1,836 روپے کا ہے جبکہ بھارت میں 450 روپے کا۔ اسی طرح ڈی اے پی 3,700 روپے تھیلی ہے جبکہ بھارت میں 1,150 فی تھیلی ہے۔ زراعت کے لیے بھارت میں ڈیزل 36 روپے لیٹر جبکہ پاکستان میں 118 روپے لیٹر ہے اور پانی بھارت میں مفت جبکہ پاکستان میں 300 روپے سے 700 روپے فی گھنٹہ ہے۔ اس کے علاوہ بھارت کی حکومت 120 بلین روپے ہر سال بلاواسطہ یا بلواسطہ زراعت کے شعبے میں مراعات کی مد میں دیتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستانی کسانوں کو معمولی سی مراعات ملتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں جو زرعی مداخل کے سطح پر ٹیکس لاگو کرتا ہو۔

(دی نیوز، 6 مارچ، 2014، صفحہ 17)

پاکستان کو گندم کی بوائی کے لیے امریکن ٹیکنالوجی کی فراہمی

امریکہ نے پاکستان کو گندم کاشت کرنے کی جدید ترین ٹیکنالوجی فراہم کردی ہے۔ امریکی محکمہ زراعت (United States Deparment of Agriculture/USDA) نے یو ایس پاکستان ویٹ پروڈکٹیویٹی ان ہانسمنٹ پروجیکٹ (Wheat Productivity Enhancement Project/WPEP) کے تحت پاکستان زرعی تحقیقی کونسل (Pakistan Agricultural Research Council/PARC)، سینٹر برائے گندم اور مکئی بہتری (Centre for Maize and Wheat Improvement/CIMMYT)، یو ایس ایڈ (United States Aid for International Development/USAID) کی طرف سے منعقد کردہ مشترکہ تقریب میں بوائی کے پلانٹرز کو مختلف تحقیقاتی اداروں اور یونیورسٹیوں کے حوالے کیا۔ شروع میں یہ پلانٹرز ان اداروں میں پائلٹ پروجیکٹر کے طور پر استعمال ہوں گے اور ان سے پیداوار لیکر ٹیکنالوجی کسانوں کو پیداوار بڑھانے کے لیے منتقل کی جائے گی۔ یہ ٹیکنالوجی پاکستان میں روایتی ہاتھ سے بوائی کے طریقہ اور موجودہ فرسودہ مشینری کی جگہ استعمال ہوگی۔ USDA (یو ایس ڈی اے) کی مدد سے چلنے والے منصوبے کے تحت یہ پلانٹرز صوبوں اور یونیورسٹیوں کے استعمال کے لیے امریکہ سے درآمد کروائے گئے تھے۔ منسٹری برائے قومی تحفظ خوراک اور تحقیق (Ministry of National Food Security and Research /MNFSR) کے سیکریٹری سیرت اصغر نے کہا کہ حالانکہ ہمارے ملک کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے پر ہم بڑھتی ہوئی خوراک کی مانگ کو پورا کرنے میں زراعت کے شعبے میں تحقیق کی وجہ سے کامیاب ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بوائی کی ٹیکنالوجی کو تین دہائی پہلے منتقل ہونا چاہیے تھا لیکن ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ پلانٹرز کو مقامی پیداوار کے لیے دیا جائے گا تا کہ ٹیکنالوجی کو فروغ دے کر کسانوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ PARC (پی اے آر سی) کے چیئرمین ڈاکٹر افتخار احمد کے مطابق WPEP (ڈبلیو پی ای پی) پروجیکٹ نے پیداوار بڑھانے کا ہدف حاصل کر لیا ہے۔ اس کی وجہ بیماری کے خلاف مدافعت رکھنے والی گندم کا بیج، تحقیق کی صلاحیت اور بیماری کی نگرانی کے نظام میں ترقی اور انفراسٹرکچر، آلات اور اشیاء میں بہتری لاکر قومی فصل کی ترقی کے لیے پروگراموں میں جدت ہے۔ پاکستان فصلوں میں پائی جانے والی بیماری یو جی 99 (UG99) کے خطرات سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاک امریکہ اشتراک سے زرعی شعبہ میں کئی زرعی یونیورسٹیاں اور ادارے بنے ہیں۔ CIMMYT (سیمی ٹی) کے قومی نمائندہ ڈاکٹر امتیاز محمد نے کہا کہ پلانٹرز روایتی بوائی کے طریقہ کار کی جگہ لیں گے تا کہ چھوٹے کسان کی پیداواری کارکردگی بڑھ سکے۔ سیمی ٹی اور پی اے آر سی کے مطابق پاکستان میں زراعت کو جدید خطوط پر استوار کرنے پر زور دینا چاہیے۔ امریکی محکمہ زراعت کے پاکستان میں زرعی کونسلر کلے ہیملٹن کا کہنا تھا کہ پلانٹرز کا پاکستان منتقل ہونا دونوں ملکوں کے درمیان لمبی مدت کے تعاون کی نشاندہی ہے۔ انہوں نے کسان اور محقق کے درمیان روابط بڑھانے پر زور دیا تا کہ زرعی پیداوار میں بہتری آ سکے۔

(دی نیوز، 18 مارچ، 2014، صفحہ 15)

2012 کے رپورٹ کے مطابق آلودگی سے سات ملین افراد ہلاک ہوئے

عالمی ادارہ برائے صحت (World Health Organisation/WHO) کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں فضائی آلودگی سے 2012 میں سات ملین افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ WHO (ڈبلیو ایچ او) کے مطابق ان ہلاکتوں میں سے ایک تہائی ایشیاء کے ترقی پزیر ممالک میں ہوئیں جہاں قلب اور پھیپھڑوں کے امراض بہت بڑھ گئے ہیں۔ دنیا میں آٹھ میں سے ایک ہلاکت کی وجہ آلودہ ہوا ہے۔ رپورٹ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ فضائی آلودگی صحت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ آرگنائزیشن کے کوارڈینیٹر آف پبلک ہیلتھ اینڈ انوائرمینٹ ڈاکٹر کارلوس ڈورا نے کہا کہ بڑی خبر یہ ہے کہ ہمیں اب سمجھ ہے کہ آلودگی کا دل کے دورے اور فالج کے حملے میں کتنا اہم کردار ہے۔ ایجنسی کے مطابق غریب عورتیں جو دھوئیں کے بیچ میں کھانا پکاتی ہیں وہ زیادہ خطرے میں ہیں۔ اندرون خانہ فضائی آلودگی سے 4.3 ملین جبکہ کھلی فضا میں زہریلی ہوا سے 3.4 ملین اموات واقع ہوئی ہیں، بہت ساری ہلاکتیں دونوں وجوہات کی بنا پر بھی ہیں۔ جینوا سے ڈبلیو ایچ او کی رپورٹ اور عالمی بینک کی چین کی شہری ترقی پر رپورٹ ایک ہی دن شائع ہوئیں۔ بینک نے تخمینہ لگایا ہے کہ چین اگلے 15 سالوں میں شہری انفرااسٹرکچر پر 5.3 ٹریلین ڈالر خرچ کرے گا تا کہ منصوبے کے مطابق 100 ملین کسانوں کو شہروں کی طرف منتقل کیا جائے اور دیہی علاقوں کے 100 ملین افراد جو پہلے سے ہی شہری علاقوں میں آباد ہیں ان کے لیے مکمل طور پر اسپتال اور اسکول تک رسائی ممکن بنائی جاسکے۔ رپورٹ کے مطابق اگر چین اپنے شہروں کی پلاننگ عقلمندی سے کرے تو اس قیمت میں سے 1.4 ٹریلین ڈالر یا ملک کی پوری آمدنی کا 15 فیصد بچایا جاسکتا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ چین کسانوں کی زمینوں کو نجی سرمایہ کاری کرنے والوں کو فروخت کرنا روک دے۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے چین کو پیدائش سے پہلے اموات، پیدائشی نقص اور دیگر صحت سے جڑے ہوئے مسائل کی مد میں 300 بلین ڈالر سالانہ خرچے کا سامنا ہے۔ مطالعے نے حالیہ غیر شفافیت پر بھی زور دیا کہ کسانوں کو ان کی زمین کی قیمت کا صرف 20 فیصد مل رہا ہے جو کہ دائمی بدامنی کا سبب ہے۔ اس کے علاوہ امیر اور غریب کی آمدنی میں بھی بہت

زیادہ فرق بڑھ رہا ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 27-14 مارچ، 2014، صفحہ 5)

تبصرہ

کارپوریٹ زراعت کو ایک ایسا نسخہ تصور کر لیا گیا ہے جس کے تحت زراعت اور زراعت سے وابسطہ تمام مسائل کا حل ممکن ہے۔ صنعتی زراعت کے رکھوالے جدید زراعت کو ایک ایسے دلفریب انداز میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اس شعبے سے وابسطہ تمام شراکت دار یا فریقین کو یکساں فائدہ پہنچے گا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اعداد و شمار یہ ثابت کرتے ہیں کہ جدید زراعت کے فروغ سے زرعی کاروبار کرنے والی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے منافع اور آمدنی میں سال بہ سال کئی گنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف اس شعبہ سے وابسطہ بہت بڑی آبادی قرض اور ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی ہے۔

معیاری بیج کا جھانسہ دیکر کمپنیوں کی تیار کردہ بیج کو منڈی میں فروغ دینے کے لیے قانون سازی پر زور بھی اسی مفاد پرست طبقہ کا کارنامہ ہے۔ مگر پاکستانی کسان اس کالے قانون کے خلاف اٹھ کھڑے ہیں کیونکہ بیج صرف اور صرف کسانوں کی میراث ہے۔ اسے کسی قیمت پر بھی کمپنیوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

امریکہ کا گندم بوائی کے لیے ٹیکنالوجی کی فراہمی، زرعی ماہرین کا آسٹریلیا کا دورہ، وزیرخزانہ کا زراعت میں سرمایہ کاری پر زور، حکومت کا بھارت کے ساتھ آزادتجارت کوتسلیم کرنا وہ دیگرعوامل ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ مفاد پرستوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے آپس میں مضبوط گٹھ جوڑ کر رکھی ہے۔

سرمایہ کاری کا پرچار اب مذہبی تقدس حاصل کرتا جارہا ہے۔ صنعتی پیداوار سے ماحول کی آلودگی، اعصابی، پھیپڑوں اور جلدی امراض کی شکل میں بڑھ چڑھ کر نظر آرہے ہیں لیکن اس شعبے میں سرمایہ کاری کرنے والے عوام دشمن حکومتوں کے لیے قابل احترام گردانے جاتے ہیں۔ اس طرح غریب مزدور و کسان کبھی جان لیوا آلودگیوں کے ہاتھوں اور کبھی قرض میں ڈوب کر سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ صنعتی زراعت میں مہنگی کیمیائی پیداواری مداخل کے استعمال سے کسان قرض میں ڈوب کر جب زمین کھو دیتا ہے تو وہ گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ لیکن شہر میں بھی کوئی آسودہ روزی حاصل نہیں۔

حکمران طبقہ ہر جگہ شہر ہو یا دیہات، ایک صوبہ ہو یا دوسرا مزدور کا استحصال کررہا ہے۔ اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حکومت کس کی ہے۔ حکومت مرکز یا پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی ہو یا خیبر پختون خواہ میں انصاف کے علم برداروں کی، حکمرانی کی روش یکساں ہے اور وہ یہ ہے کہ پسے ہوئے پسماندہ طبقات کو مزید قرض و بھوک کی دلدل کی طرف دھکیلا جائے۔ ورنہ کیا کے پی کے میں تحریک انصاف کی یہ حکومت بیج کا قانون سب سے پہلے صوبائی اسمبلی میں پیش کرتی اور پنجاب کی حکومت اس عمل میں فوراً پیچھے کیوں ناجاتی کیونکہ ان کے تو انتخابی منشور میں ہی جدید زراعت اور نئی ٹیکنالوجی کے فروغ کے ذریعہ زراعت کی ترقی شامل ہے۔

کسانوں کو آج کئی مسائل کا سامنا ہے ایک طرف پانی کی عدم دستیابی دوسری طرف حکومت کی طرف سے کسی قسم کا بھی تعاون نہ ملنا۔ پھر سونے پہ سہاگہ ہماری سرکار کمپنیوں اور عالمی اداروں کے دباؤ پر کسان دشمن قانون سازی میں مصروف! ان عوامل سے مسائل بڑھ تو سکتے ہیں پر حل نہیں ہوسکتے۔ جب تک کہ مزدور و کسان روبرو کھڑا ہوکر اپنا حق نہ چھین لے!